مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانی

ادارہ اسلامیات

لاہور - کراچی - پاکستان

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ

ادارہ اسلامیات

پبلشرز، بک سیلرز، ایکسپورٹرز

★ ... روڈ، لاہور
فون ۷۳۲۴۴۱۲ ... ۹۲-۴۲-۷۳۱۰

★ ۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان
فون ۷۲۴۳۹۹۱ - ۷۳۵۳۲۵۵

★ موہن روڈ
چوک اُردو بازار، کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱

اشاعت ______ مارچ ۱۹۷۶ء

باہتمام ______ محمد اشرف عثمانی

طباعت ______ عرفان افضل پرنٹنگ پریس، لاہور

ناشر ______ ادارہ اسلامیات لاہور

قیمت ______

ملنے کے پتے :-

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور

دارالاشاعت مولوی مسافر خانہ کراچی ۱

ادارۃ المعارف ، کراچی ۱۴

مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فرقہ تراشی کے لئے فرقہ بندی کا ماتم

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں، نام نہاد فرقہ بندیوں کا ذکر کرکے کسی نئے فرقہ کی بنیاد قائم کرنے کا ادھر کچھ دنوں سے عام دستور ہو گیا ہے۔ ماتم کرنے والے پہلے امت مرحومہ کے اس خود تراشیدہ انتشار و تشتت کا مرثیہ پڑھتے ہیں اور اپنی ان ہی سینہ کوبیوں نوحہ خوانیوں کے ہنگاموں میں ماتم سراؤں کا یہ گروہ شعوری یا غیر شعوری طور پر چاہتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے پھاڑ کر کسی ٹولی یا ٹکڑی کو اپنے اوپر جمع کرے۔ بظاہر ان لوگوں کا حال حیدرآباد کے اس امیر کا سا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ دشنام طرازی اور گالیوں کے بکنے کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا تھا۔ کسی نے ان ہی امیر صاحب کی شکایت وقت کے انگریزی ریزیڈنٹ سے کی، ریزیڈنٹ نے امیر صاحب کو بلایا اور پوچھا کہ آپ لوگوں کو سنتا ہوں کہ گالیاں دیا کرتے ہیں۔ آپ کی یہ عادت اچھی نہیں ہے، امیر صاحب آگ بگولا ہو گئے اور طیش میں آکر ریزیڈنٹ کے سامنے فرمائشی گالیوں کے ساتھ چغلی کھانے والے کی تکذیب کرنے لگے، کہہ رہے تھے کہ کس ..... ایسے تیسے نے آپ تک یہ بات پہنچائی۔ ریزیڈنٹ مسکرانے لگا کہ آپ خود میرے سامنے بھی تو اسی کا اعادہ فرما رہے ہیں۔ جس کا انتساب چغلخور نے آپ کی طرف کیا تھا[1]

[1] ساتویں صدی ہجری کے واقعات کو درج کرتے ہوئے الیافعی نے مرۃ الجنان میں ایک (باقی صفحہ ۶ پر)

خود ایک نئے فرقہ کو مسلمانوں میں بڑھا دینے کے لئے فرقہ بندیوں پر لعنت وملامت کرنے والوں سے کون پوچھے کہ جس حرکت کا ارتکاب تم خود کر رہے ہو اُسی پر تمہارا یہ لعن وطعن کس حد تک درست ہو سکتا ہے؟

اسی حال کو دیکھ کر خاکسار نے متعدد مضامین اور کتابوں میں اصل حقیقت کو ظاہر کرتے ہوئے حالانکہ بار بار لکھا کہ کرۂ زمین کی اتنی طویل وعریض اُمت جس کی تعداد ارب نہیں تو نصف ارب سے یقیناً زیادہ ہو چکی ہے[1] اور ایشیا افریقہ کے سوا یورپ کے بعض دور دراز علاقوں تک پھیلی ہوئی ہے، اس میں زبانوں ہی

(بقیہ صفحہ ۵) اس واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے کہ نظامیہ بغداد کے چند ساتذہ نے قوت حافظہ کو بڑھانے کیلئے بلاذر (بھلاواں) کھا لیا اور سب پاگل ہوگئے اور شہر سے باہر جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ ان میں سے ایک مولوی صاحب چند دن بعد اس ہیئت کذائی کے ساتھ بغداد واپس ہوئے کہ ننگ دھڑنگ تھے، بالکل عریاں اور ننگے صرف سر پر بڑا طویل وعریض عمامہ بندھا ہوا تھا۔ شہر کے لوگوں سے ملتے اور کہتے کہ ہمارے رفقاء نے جن میں خود میں بھی تھا بھلانواں کھا لیا اور سب تو پاگل ہوگئے بس فقیر ہی کسی طرح ہوش وحواس کو قائم کئے ہوئے تھا۔ انتہائی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ گفتگو فرماتے۔ لوگ ہنستے ص ۲۰۸ ج ۳ مرآۃ الجنان یافعی۔

حاشیہ صفحہ ہذا [1] مرحوم لیگ آف نیشن کے محکمہ اعداد وشمار نے جو فہرست شائع کی تھی اس میں ستر کروڑ کے قریب مسلمانوں کی تعداد ظاہر کی گئی تھی اس پر بھی کئی قرن گذر چکے ہیں۔ اس موقعہ پر امیر شکیب ارسلان مرحوم کی اس تنبیہ کو بھی یاد رکھنا چاہیئے جس کا ذکر انہوں نے گھراب سٹوڈارڈ نیو ورلڈ آف اسلام کے عربی ترجمہ کے نوٹ میں کیا ہے اس پر مرحوم نے لکھا ہے کہ یورپ کے عام مورخین کا یہ عام دستور ہے کہ بہت قدیم زمانہ میں مسلمانوں کی تعداد کا جو تخمینہ یورپ میں کیا گیا تھا اسی کو دہراتے رہتے ہیں حالانکہ روز بروز مسلمانوں کی تعداد مسلسل بڑھتی ہی چلی جاتی ہے جرمنی کے ایک محقق ڈاکٹر نالس نے صرف افریقہ کے مسلمانوں کی تعداد کا تخمینہ کرتے ہوئے تیس سال پہلے لکھا تھا چھتیس ملین کے قریب ہے اسی طرح انڈونیشیا روس چین وغیرہ کے مسلمانوں کی تعداد وجغرافیہ کی کتابوں میں گھٹا کر بتانے یورپ والے عموماً عادی ہیں۔ دیکھو کتاب کا عربی ترجمہ ص ۳۱ ج ۱۔

کے حساب سے دیکھا جائے تو سینکڑوں زبانوں کی بولنے والی قومیں شریک ہیں۔ یہی حال نسلوں کا ہے۔ شاید ہی آدم کی اولاد کی کوئی قابل ذکر نسل ایسی باقی ہوگی جس کے افراد "امت اسلامیہ" کے اس وسیع دائرے میں شریک نہیں ہیں۔ ان میں سامی آریائی، تورانی نسلوں کے گورے، کالے، لال، پیلے سب ہی رنگ کے لوگ پائے جاتے ہیں

ستر کروڑ مسلمانوں میں صرف دو تین مذہبی فرقے پائے جاتے ہیں

لیکن ان باتوں کے باوجود نصف ارب سے زیادہ تعداد والی اس اُمت میں اگر دیکھا جائے تو دس بیس نہیں واقعہ یہ ہے کہ تین چار فرقوں سے زیادہ ایسے گروہ نہیں مل سکتے۔ جن کے اختلاف وتفریق کو واقعی اختلاف وتفرق قرار دیا جا سکتا ہے سب سے بڑا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہیں اہلسنت والجماعت یا سنی مسلمان کہتے ہیں ان کے بعد دوسرا طبقہ شیعوں کا ہے اور جی چاہے تو مسقط اور عمان جیسے ساحلی علاقوں یا افریقہ کے بعض دور دست خطوں میں رہنے والے خوارج یا خارجی مسلمانوں کو بھی مسلمانوں کے تیسرے فرقے کی حیثیت سے شمار کر لیجئے۔ حالانکہ جہاں کروڑوں کی بات ہو رہی ہو وہیں خارجی مسلمان جن کی تعداد جہاں تک میرا خیال ہے لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے بھی بہ مشکل متجاوز ہو سکتی ہے ان کا شمار کرنا تمسخر کے سوا کچھ اور بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ لے دے کر یہی سُنی اور شیعہ دو فرقے مسلمانوں میں ایسے ضرور ہیں، جنہیں اس سلسلہ میں واقعی اہمیت حاصل ہے، ان دونوں فرقوں کے اختلافات یقیناً ایسے اختلافات ہیں جن کی بنیاد پر کسی مذہبی اُمت کا ایک فرقہ دوسرے فرقہ سے جُدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اہلسنت والجماعت کی تعداد کی کثرت کا مقابلہ

اگر شیعہ فرقہ کے مسلمانوں کی تعداد سے کیا جائے تو گو خوارج کی طرح اُن کو قریب قریب صفر قرار دینا تو حقائق و واقعات کی تکذیب ہو گی لیکن ساٹھ اور ستر کروڑ کے درمیان مسلمانوں کی جو تعداد ہے اس میں سے بمشکل چند کروڑ کو الگ کر دینے کے بعد باقی صرف سنی مسلمان رہ جاتے ہیں۔ یہاں صحیح طور پر شیعہ طبقہ کے مسلمان کی تعداد بتا نہیں سکتا لیکن جن جن ممالک میں شیعہ طبقہ کے لوگ آباد ہیں ہم ان سے بھی واقف ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ایران کے سوا اسلامی ممالک میں شاید ہزار میں ایک سے زیادہ ثابت ہونا ان کا آسان نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے ادیان و مذاہب کے مقابلہ میں منجملہ دوسری خصوصیتوں کے اسلام کی یہ بھی گویا ایک اعجازی خصوصیت ہے کہ جہاں غیر اسلامی اقوام میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک ایک مذہب ایک ایک دین کے ماننے والوں میں سینکڑوں فرقے پائے جاتے ہیں اور کیسے فرقے ؟ کہ ان کے معبود تک میں اتفاق نہیں اور تو اور گویا خدا پر بھی وہ متحد نہیں ہیں۔ قوموں کا جائزہ اس نقطہ نظر سے لیجئے۔ کتابوں میں پڑھیئے یا گھوم پھر کر دیکھیئے تو آپ مبہوت ہو کر رہ جائیں گے کہ مذہب کی بنیاد پر جہاں ایک ایک قوم اتنی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے وہیں دو یا زیادہ سے زیادہ تین فرقوں میں مسلمانوں کے دینی اختلاف منحصر ہو کر رہ گئے ہیں۔

مغالطہ کی وجہ

مغالطہ دراصل لوگوں کو ان کتابوں سے ہو جاتا ہے جو "ملل و نحل" کے عنوان پر مسلمانوں کے ہاں وقتاً فوقتاً لکھی جاتی رہی ہیں یعنی فرقوں اور طبقوں کے حالات جن میں بیان کئے گئے ہیں ان کتابوں میں یہ درست ہے کہ غیروں کے ساتھ ساتھ

مسلمانوں کے مذہبی فرقوں اور پارٹیوں کی بھی بڑی لمبی چوڑی طویل الذیل فہرست پائی جاتی ہے لیکن جو کچھ کتابوں میں لکھا ہوا ہے کاش اس کی زحمت بھی اسی کے ساتھ اٹھائی جاتی کہ اس مکتوبہ فہرست کو واقعات کی دنیا پر منطبق کر کے دیکھا جاتا کتابوں میں بیشک مسلمانوں کے ان نت نئے بھانت بھانت فرقوں کا ذکر ضرور پایا جاتا ہے لیکن ان فرقوں کا اور ان کے طرح طرح کے ناموں کا وجود دنیا میں باقی رہا ہے ؟ اس کی طرف لوگوں کی توجہ نہیں ہوئی ورنہ ان پر واضح ہوتا کہ کتابوں کے سوا اب ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔

فرقہ بندیوں کی کثرت ابتدا اسلام میں کیوں ہوئی

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پہلے تو سیاسی اختلافات نے کچھ مذہبی رنگ اختیار کر لیا تھا اور ان ہی سیاسی اختلافات کی بنیاد پر کچھ پارٹیاں مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھیں جو واقع میں تو تھیں سیاسی پارٹیاں لیکن اس زمانہ کے خاص مذاق اور ماحول نے ان سیاسی پارٹیوں کو مذہبی فرقوں کے قالب میں ڈھال دیا تھا۔

"سیاست ہی اسلام کی روح ہے"

فتنہ کی ابتدا اسی مسئلہ سے ہوئی

ان سیاسی اختلافات کی ابتدا سچ پوچھئے تو اس مسئلہ سے ہوئی یعنی ایک طرف مسلمانوں میں ایک گروہ ان لوگوں کا پیدا ہو گیا جن کے نزدیک اسلام کا سب سے زیادہ اہم، سب سے زیادہ اقدم عنصر "سیاست" تھا شہرستانی

کے الفاظ میں ان کا خیال تھا کہ

ما کان فی الدین و الاسلام	دین اور اسلام میں اس سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں
امرٌاهمّ من تعین الامام	ہے کہ امام یعنی مسلمانوں پر حکمرانی کی باگ جس کے سپرد
حتی تکون مفارقۃ الدنیاً	ہو) اسی کو متعین کر دیا جائے تاکہ دنیا سے جاتے ہوئے
علی فراغ من امر الامّت	امت کے متعلق پیغمبر کے دل میں کسی قسم کی تشویش
(ص ۱۵۹ ج ۱)	باقی نہ رہے اور اطمینان کے ساتھ دنیا کو چھوڑ دیں۔

سیاست کی اسی غیر معمولی اہمیت کے احساس نے ان میں بعضوں کے اندر یہ خیال بھی پیدا کر دیا تھا جیسا کہ شہرستانی ہی نے لکھا ہے کہ

الدّین امران معرفۃ الامام	امام (جو حکومت کی تنظیم کرے) اس کا پالینا اور امانت کا
و اداءُ الامانت۔	ادا کرنا بس ان ہی دونوں چیزوں کا نام دین ہے۔

مطلب گویا ان کا یہ تھا کہ حکومت کی تنظیم اور باشندوں میں اس احساس کا پیدا کر دینا کہ باہم ان میں ہر ایک دوسرے کا امین ہے یوں دھوکہ فریب وغیرہ کے عیوب سے ملک جب پاک ہو جائے تو مذہب کا مقصد پورا ہو گیا، بغیر کسی پس و پیش کے وہی کہا کرتے تھے، شہرستانی نے نقل کیا ہے کہ :۔

"حکومت کی تنظیم اور احساس امانت کو بیدار کر لینے میں کامیاب ہو جانے کے بعد پھر کسی قسم کا کوئی شرعی مطالبہ باقی نہیں رہتا۔ (ص۱۵۹ ج۱)

ان ہی میں بعض ایسے بھی تھے جو امانت والی قید کو بھی حذف کر دیتے تھے اور مدعی تھے کہ

الدین معرفۃ الامام فقط	دین صرف امام یعنی حکومت کی تنظیمی قوت کے نمائندے کا پا لینا ہے۔

اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بعضوں نے یہ پھیلانا بھی شروع کیا کہ

ان الدنیا لا تفنی	دنیا کا موجودہ نظام کبھی فنا نہ ہوگا۔

اور کہتے تھے کہ مذاہب و ادیان جنت و دوزخ وغیرہ کے الفاظ اور اصطلاحیں جو پائی جاتی ہیں ان کا مطلب بقول شہرستانی ان کے نزدیک یہ تھا کہ

الجنۃ هی التی تصیب الناس	لوگوں کو دنیا میں جو بھلائیاں میسر آتی ہیں اور جو
من خیر و نعمۃ و عافیۃ و ان	نعمتیں ملتی ہیں، سکھ اور راحت کی زندگی کے پالینے
النار هی التی تصیب الناس	میں کامیابی بس اسی کا نام جنت ہے اور برائیاں سختیاں
من شر و مشقۃ و بلیۃ (ملل و نحل شہرستانی ج۱)	مصائب جنہیں دنیا میں لوگ جھیلتے ہیں بس یہی جہنم ہے۔

مقصد ان لوگوں کا یہی تھا کہ اچھی حکومت میں باشندوں کو امن و امان کی وجہ سے جن راحتوں اور نعمتوں سے لذت اندوز ہونے کا موقعہ ملتا ہے مذاہب نے سکھ کی اسی زندگی کا نام جنت رکھ دیا ہے اور حکومت کی بدانتظامی کی وجہ سے جن مصائب و آلام، بے چینی اور بدامنی کے شکار لوگ ہو جاتے ہیں اس کی تعبیر مذاہب میں جہنم سے کی گئی ہے۔

قریب قریب یہ اسی قسم کی بات ہے جو اس زمانے میں بعضوں کی طرف سے پھیلائی گئی ہے کہ فتوحات کی وجہ سے دجلہ، فرات، نیل اور گنگا کی جن نہروں اور دریاؤں پر مسلمانوں کا قبضہ دلایا جانے والا تھا اور بڑے زرخیز زرریز عریض و طویل ممالک جو مسخر ہونے والے تھے، قرآن میں مسلمانوں سے ان ہی چیزوں کا وعدہ کیا گیا تھا اس کی تعبیر جنت سے کی گئی تھی اور ان ہی چیزوں سے محروم ہو جانے کے بعد جن حالات میں مسلمان مبتلا ہونیوالے تھے ان کو قرآن نے جہنم کے لفظ سے ادا کیا تھا۔

اور یہ تو گویا ان کے اعتدال پسندوں کا خیال تھا، لیکن حدود سے تجاوز کرتے ہوئے اسی سلسلہ میں کچھ لوگ اسی طبقہ میں جو سیاست ہی کو اسلام کا سب کچھ قرار دیتے تھے اس حد تک ترقی کر کے پہنچ گئے تھے کہ حکومت کے قائم کرنے والی قوت سے مزاحمت کرنے والوں کو جہنم کے نام سے کہتے تھے کہ قرآن میں موسوم کیا گیا ہے۔ شہرستانی کے بجنسہ الفاظ ان کے اس خیال کے متعلق یہ ہیں کہ

ان الجنة رجل امرنا بموالاته وهو امام الوقت وان النار رجل امرنا بمعاداته وهو خصم الامام۔ ص۱۱۵ ج ۱	جنت اس شخصیت کی تعبیر ہے جس کی پشت پناہی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے یعنی وقت کا امام (حکمران) اور اسی حکمران کے دشمن کا نام دوزخ ہے جس کی مخالفت کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔

نماز روزہ والا اسلام عامیانہ دھرم ہے

ان کے نزدیک نماز روزہ والا اسلام ایک عامیانہ دھرم سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا اسی بنیاد پر بقول شہرستانی ان میں کہنے والے کبھی کبھی یہ بھی کہتے کہ:۔

"فرائض (مثلاً نماز روزہ، حج و زکوٰۃ) وغیرہ سے مطلب یہ ہے کہ ان قوتوں کے آگے بڑھانے میں ہم اپنی توانائیوں کو خرچ کریں جن کی پشت پناہی حکومت کے صحیح نمائندے یعنی امام کے لئے ضروری ہے اور محرمات یعنی جو باتیں مذہب میں حرام اور ناجائز ہیں ان سے مقصد یہ ہے کہ اس راہ میں جن کی مخالفت ضروری ہے ان سے ہم کنارہ کش رہیں۔" (ص ۱۱۵ ج ۲)

حالانکہ عموماً اس گروہ کی اکثر ٹولیوں کا خیال تھا کہ اپنے بعد پیغمبر نے اسلامی حکومت کے نظام کو قائم رکھنے کے لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو نامزد کر دیا تھا لیکن سیاست ہی دین کی اصلی روح ہے اسی خیال نے بعضوں میں اس قسم کے رجحانات بھی پیدا کر دیئے تھے، جیسا کہ شہرستانی نے لکھا ہے کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام صحابیوں پر کفر کا الزام لگاتے تھے حتیٰ کہ حضرت علی کو بھی نہیں بخشتے تھے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر ان کا یہ اعتراض تھا کہ:۔

"اپنے جائز حق کے مطالبہ میں انہوں نے غفلت سے کام لیا حالانکہ ان پر واجب تھا کہ کھل کر میدان میں آجاتے اور جو کام اُن کے سپرد کیا گیا تھا، اس کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیتے۔" ص۱۳ ج۲ شہرستانی

ان ہی لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ابن حزم نے لکھا ہے کہ گو فرقہ کے بانی کا خیال حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے متعلق بھی تھا لیکن بعد کو:۔

"اس گروہ کے عام افراد کا مسلک یہ ہو گیا تھا کہ عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد علی مرتد ہونے کے بعد پھر مسلمان ہو گئے تھے یعنی جب کھل کر وہ میدان میں آگئے اور تلوار ہاتھ میں سونت لی۔"

واللہ اعلم بالصواب اسی موقعہ پر ابن حزم نے اسی گروہ کے بعض افراد کی طرف (العیاذ باللہ) دلچسپ کہئے یا دل دوز یہ خبیث نظریہ بھی منسوب کیا ہے کہ:۔

الذنب فی ذلك الی النبی صلی الله علیه وسلم اذ لم یبین الامر بیانا رافعا	قصور (سیاست) کے اس باب میں خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا کہ مسئلہ کو انہوں نے اس طریقہ سے کھول

للاشکال. ص. ۱۴۰ ج ۳ ابن حزم   کر بیان نہیں کیا جس سے دشواریاں حل ہوجائیں۔

گویا ان کا خیال تھا کہ عرب کے باشندوں نے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اپنے باپ دادوں کے دین کو چھوڑ دیا تھا، اپنی جان اپنا مال سب آپ پر قربان کر رہے تھے تو کوئی وجہ نہ تھی اگر اپنے بعد مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے متعلق دوٹوک فیصلہ کی صورت میں جو کچھ حکم دے دیتے لوگ اس سے سرتابی کرتے لیکن گومگو میں قصے کو رکھ کر بے ایمانوں کا یہ گروہ کہتا تھا کہ خود پیغمبر ہی کی طرف سے (العیاذ باللہ) کوتاہی ہوئی۔ بہرحال "حکومت ہی سب کچھ ہے"۔ اور اس کے سوا جو کچھ ہے سب کی حیثیت صرف وسائل اور ذرائع کی ہے، اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر ان میں بطور فیصلہ کے یہ مانا جاتا تھا کہ جس وقت جس قسم کی بات سے کام نکلنے کی توقع ہو اس کو ترک نہ کرنا چاہیئے۔ شہرستانی نے لکھا ہے کہ بڑے بڑے توقعات اپنے ماننے والوں کو دلاتے اور باور کراتے کہ ہمیں اس قسم کے فتوحات کی بشارتیں ملی ہیں، لیکن جب ان کا ظہور نہ ہوتا تو کہہ دیا کرتے کہ :۔

"خدا نے اپنا فیصلہ بدل دیا"

یا کہتے کہ :۔

"اب خدا کی مصلحت بدل گئی"

یا اس کا ارادہ بدل گیا"

اسی نظریہ کی تعبیر وُہ "مسئلہ بدر" سے کرتے تھے، ان کے نزدیک سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے ہر قسم کی غلط بیانی مذہباً و دیناً جائز بلکہ شائد واجب اور ضروری ہے" تقیہ" اسی نظریہ کی اجمالی تعبیر ہے۔

یہ ایک اجمالی عنوان تھا جس کے نیچے وہ ساری باتیں درج تھیں۔ جن پر آج کل عموماً یورپ کی سیاست کی بنیاد قائم ہے گویا یورپ کی سیاسی دلچسپیوں نے تو صرف ایک میکاوَلی کو پیدا کیا تھا، لیکن مسلمانوں میں "میکاوَلی" سے پہلے بہت پہلے "میکاویلوں" کا ایک گروہ ہی پیدا ہو گیا تھا اور اپنے خیال کی توثیق و تصدیق میں وہ قرآنی آیات پیش کیا کرتا تھا، اور ٹھیک ان ہی لوگوں کے مقابلہ میں جن کے نزدیک سیاست کے سوا اسلام گویا اور کچھ نہ تھا ان ہی کے توڑ پر مسلمانوں ہی میں دوسرا طبقہ بھی نکل پڑا تھا۔ جن کا خیال تھا۔

لا یجب نصب الامام اصلا۔   امام (ناظم حکومت) کے قائم کرنے کی سرے سے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔

دوسرا فرقہ جو سرے سے حکومت کی ضرورت کا منکر تھا

میر سید شریف جرجانی نے اس طبقہ کے اسی سیاسی نظریہ کا تذکرہ کرکے شرح مواقف میں یہ بھی نقل کیا ہے کہ اپنے خیال کی تائید میں منجملہ اور باتوں کے وہ کہا کرتے تھے کہ :۔

"کیا حق ہے کہ اپنے ہی جیسے آدمی کو آدمی پر حکمراں بنا دیا جائے اور خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے . . . . ہم کیوں مجبور کئے جائیں کہ دوسرے کے حکم کو مانیں"

اپنی تائید میں وہ یہ بھی کہتے تھے کہ :۔

"حکومت جب بھی قائم ہوگی بعضوں کے اغراض کے مطابق نہ ہوگی، خواہ مخواہ یہی لوگ مخالفت پر اٹھ کھڑے ہوں گے پھر بھڑکے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے"

وہ اس مشاہدے کو بھی پیش کرتے تھے کہ :۔

"بادیہ یعنی صحرائی علاقوں کے باشندے کسی قسم کی حکومت کی تنظیم کے بغیر تاریخ کے نامعلوم زمانے سے زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں اور اپنے مصالح و اغراض کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس قسم کا تعلق رکھتے ہیں کہ کوئی کسی پر زیادتی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا"

شرح مواقف مرصد رابع ص۶۰۴ مطبوعہ قسطنطنیہ الجرجانی ہی نے لکھا ہے کہ ان ہی میں بعض کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ "امن کے زمانہ میں حکومت کی ضرورت نہیں، البتہ ملک میں جب فساد و فتنہ پھوٹ پڑے تو اس کو دبانے کے لئے وقتی طور پر کسی قسم کی حکومت قائم کر لینی چاہیئے۔ مقابلہ میں دوسرا گروہ کہتا تھا کہ نہیں امن ہی کے زمانہ میں تو حکومت کی ضرورت ہے کہ اس وقت لوگ آئینی زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ لیکن فتنہ و فساد میں تو ہر ایک اپنے خیال میں مست ہو جاتا ہے اس وقت حکومت قائم کرنے سے بجز نقصان کے اور کسی فائدہ کی توقع نہ کرنی چاہیئے۔

بہرحال افراط و تفریط کے ان دونوں سیاسی نظریوں کے درمیان

تیسرا نظریہ قائم کیا گیا۔ شہرستانی نے لکھا ہے۔

"حکومت کی ضرورت حق تعالیٰ کی معرفت اور توحید کے لئے ضروری نہیں ہے"

اور انصاف پسندوں نے یہ طے کر دیا تھا جیسا کہ علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ :۔

"قیام حکومت کی نوعیت مسلمانوں کے ان فرائض کی ہے جن کو فرض کفایہ کہتے ہیں، یعنی ہر ہر مسلمان سے انفرادی مطالبہ اس کا نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اجتماعی طور پر چاہیئے کہ اس کام کو وہ پورا کریں" (شرح مقاصد ص ۳۷۱)

علامہ تفتازانی نے اسی سلسلہ میں یہ بھی لکھا ہے کہ :۔

"قیام حکومت چونکہ ایک عملی کاروبار ہے اس لئے عقائد سے اس مسئلہ کا تعلق نہیں ہے بلکہ فقہی احکام کے ذیل میں اس کو شمار کرنا چاہیئے"

بہرحال اتنی بات تسلیم کر لی گئی کہ :۔

"حدود اور سزاؤں کے لئے یا حقوق کے جھگڑوں کو چکانے کے لئے اور یتیموں اور بیواؤں کی نگرانی کے لئے اللہ کے کلمہ کو بلند رکھنے کے لئے حکومت کی ضرورت ہے"

خلاصہ یہ ہے کہ :۔

یکون للمسلمین جماعۃ — مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کی تنظیم کیلئے

ولا یکون الامر فوضی	حکومت کا قائم ہونا ناگزیر ہے۔ تاکہ عوام میں
بین العامۃ۔	منتشر اور غیر منظم ہوکر مسلمانوں کی زندگی
۱۶۵ شہرستانی ج ۲	نہ رہ جائے۔

یہ اور اسی قسم کے خیالات کو پیش کر کرکے چاہا گیا کہ سیاست کے مسئلہ میں غلو سے مسلمانوں کے بر طبقات کام لے رہے ہیں۔ ان کو اعتدال کے نقطہ تک کھینچ کر لایا جائے اور مسلمانوں کی اکثریت نے اسی خیال کو تسلیم بھی کر لیا۔ لیکن "سیاست" ہی اسلام کا سب کچھ ہے " اس پر اصرار کرنے والوں کا اصرار بہر حال باقی ہی رہا۔ ان لوگوں کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا تھا کہ اسلام کا جو سب کچھ تھا" اسی کو غیر متفصل حال پر چھوڑ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے کیسے تشریف لے جاسکتے تھے اور خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی قطعی فیصلہ جیسا کہ ان لوگوں کا دل چاہتا تھا، کیا یا نہ کیا۔ لیکن کسی طرح یہ مشہور ہی کر دیا گیا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے قطعی فیصلہ کر دیا تھا۔ شہرستانی نے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے:۔

" ہو نہیں سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوں ہی مسلمانوں کو شتر بے مہار بے سروں کی فوج کی حالت میں چھوڑ کر دُنیا سے تشریف لے جاتے اور ہر مسلمان کے لئے موقعہ اس کا چھوڑ دیتے کہ جس کے جی میں آئے وہ اس مسئلہ میں رائے قائم کرے اور ہر ایک اپنی راہ پر چلا جائے "

اُن کا بیان تھا کہ:۔

" اختلافات اور جھگڑوں کے مٹانے ہی کے لئے تو پیغمبر آئے تھے۔ ان کی بعثت کی غرض ہی یہ تھی کہ بچھڑے لوگوں کو وحدت کے رشتہ میں منسلک کر دیں "

اسی لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ اسلام کی اسی " جوہری روح " کو ابہام و تذبذب کے حال میں چھوڑ کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لیجاتے۔

حکمرانی کے استحقاق کے متعلق مختلف نظریات

مگر جب یہ سوال اُٹھا کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فیصلہ کیا تھا تو جواب میں اختلافات کا طوفان برپا ہو گیا، ایک گروہ کہتا تھا کہ شخصی نامزدگی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہو گئی تھی یعنی مسلمانوں کی حکمرانی کی باگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہی صاحب اپنے ہاتھ میں لیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فیصلہ کرکے تشریف لے گئے۔ دوسرا گروہ مدعی ہوا کہ "شخص" تو نہیں البتہ " قبیلہ " کو آپ نے متعین کر دیا تھا کہ میرے بعد عرب کے فلاں قبیلہ والے سیاسی قیادت کا فرض مسلمانوں میں انجام دیں۔

کون سا قبیلہ؟ اس میں قریش۔ ہاشمی خاندان۔ عباسی خاندان۔ علوی خاندان سب ہی کے نام پیش ہوتے رہے۔

اسی سلسلہ میں بعضوں کا خیال تھا کہ صرف عبدالمطلب کی اولاد مسلمانوں پر حکومت کرنے کا حق رکھتی ہے، ابن حزم نے لکھا ہے کہ عبدالمطلب کی ساری اولاد کو حکومت کا دینی حق ان لوگوں کے نزدیک حاصل تھا حتیٰ

کہ ابوطالب اور عباس کے ساتھ کہتے تھے کہ ابولہب[1] تک کی اولاد بھی اس حق کی جائز وارث اور مساوی طور پر اس کی حصّہ دار ہے۔

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ سیاسی نظریہ ان کا تھا جنہوں نے دلائل سے ثابت کیا تھا کہ :۔

لا تجوز الخلافۃ الا فی بنی امیہ بن عبد شمس ج۵ ص ابن حزم

خلافت یعنی حکمرانی کا استحقاق امیہ بن عبد الشمس کی اولاد کے سوا اور کسی کے لئے جائز ہی نہیں ہے۔

ابن حزم ہی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ :۔

"میری نظر سے ایک ایسی کتاب بھی گذری ہے جسکے مصنف عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاندان کے کوئی صاحب ہیں۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ابوبکر و عمر کی اولاد کے سوا حکمرانی کا استحقاق مسلمانوں میں کسی کو شرعاً حاصل نہیں۔"

حیاتِ جاوید کا نظریہ

باقی جو کہتے تھے کہ قبیلہ نہیں بلکہ خاص شخص کو اپنے بعد مسلمانوں پر

[1] ابولہب جیسا کہ معلوم ہے کفر ہی کی حالت میں مرا لیکن اس کی اولاد مسلمان ہو گئی تھی۔ بنی امیہ کے عہد میں یزید بن عبدالملک اموی حکمران کے حکم سے ابولہب کے خاندان کا ایک آدمی مکہ معظمہ سے دارالسلطنت دمشق بلایا گیا تھا۔ الحماسی والی مشہور نظم صفحا من بنی اذہل الخ کو خاص طریقہ سے جھاڑ بنا بنا کر ادا کیا کرتا تھا۔ یزید اس کے طرز ادا سے بہت محظوظ ہوا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ابولہب ہی اس طریقہ ادا کا بانی تھا اور نسلاً بعد نسلٍ گانے کی یہ خصوصیت اسکے خاندان میں منتقل رہی۔ (روح المذہب ذکر یزید بن عبدالملک)

حکمران بننے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نامزد کر دیا تھا۔ مراد ان کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات مبارک سے تھی ان لوگوں کا خیال تھا کہ علی کی حکومت قائم ہونے کے ساتھ ہی دنیا ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہو جائے گی۔ اور انصاف وعدل سے بھر جائے گی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حکومت قائم بھی ہوئی اور جیسا کہ معلوم ہے آپ کا سارا عہدِ خلافت مفاسد اور فتن ہی کے دبانے میں گذر گیا اور آپ کے بعد جو کچھ ہوا وہ ان لوگوں کے منشا کے مطابق نہ تھا اس لئے ایک گروہ ان میں کھڑا ہو گیا جس نے سرے سے حضرت والا کی شہادت اور وفات ہی کا انکار کر دیا۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اسی گروہ کا رئیس ابن سبا کہا کرتا تھا کہ :۔

"ستّر دفعہ بھی علی کا بھیجا یعنی دماغ میرے سامنے لایا جائے جب بھی میں ان کی موت کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ وہ وفات ہی نہیں پا سکتے جبتک کہ دنیا کو عدل و انصاف سے اسی طرح بھر نہ دیں۔ جیسے وہ جور اور ظلم سے بھر گئی ہے" ج۴ ص۱۳۹ ابنِ حزم

ان ہی لوگوں کا خیال تھا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ "بادل میں رہتے ہیں"

اور بادل ہی سے آواز دیں گے کہ فلاں میرے نمائندے کا لوگ ساتھ دیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے زندہ رہنے کا نظریہ جب ایک دفعہ گھڑ لیا گیا تو پھر نہ پوچھئے کہ کیا کیا ہوا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد میں جس کی طرف بھی امامت منسوب

کی گئی لیکن واقعی دنیا کی حکومت ان کو حاصل نہ ہو سکی تو ایسی صورت میں ان میں سے ہر ایک کے متعلق اسی دعوی کا اعلان کیا گیا۔

حی لم یمت ولا یموت حتی	وہ زندہ ہیں اور جب تک دنیا کو انصاف وعدل سے
یخرج فیملاء الارض عدلاً کما	اسی طرح نہ بھر دیں گے جیسے وہ ظلم سے بھر گئی ہے۔
ملئت جوراً۔	اس وقت تک وہ مر بھی نہیں سکتے۔

ابن حزم نے اس سلسلہ میں نام گنواتے ہوئے لکھا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے محمد بن الحنیفہ کے نام سے جو مشہور ہیں اور مشہور سیاسی لیڈر مختار ثقفی آپ ہی کے اسم مبارک سے ناجائز نفع اٹھانے کی کوشش کرتا رہا، ان کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ :۔

" محمد بن حنفیہ رضویٰ نامی پہاڑ میں چھپے ہوئے ہیں ان کے داہنے جانب شیر اور بائیں پہلو میں ہمیشہ ایک چیتا آپ کی حفاظت کرتا رہتا ہے۔ فرشتے آپ سے باتیں کرتے ہیں اور صبح و شام غیب سے آپ کے سامنے آسمانی خوان نازل ہوتا رہتا ہے اور دو چشمے ایک پانی کا اور ایک شہد کا اسی پہاڑ میں آپ کے لئے اُبلتا ہے۔ شہرستانی ص۱۵۵

اسی طرح حسنی سادات میں سے محمد جو نفس زکیہ کے نام سے مشہور ہیں ان کو بھی معتقدوں کا ایک گروہ زندہ جاوید سمجھتا ہے۔ حالانکہ عباسی خلیفہ منصور کے زمانہ میں وہ مدینہ میں شہید ہو چکے تھے۔ اسی فہرست میں یحییٰ بن عمر جو حسین علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور اسی گھرانے کے ایک بزرگ محمد بن قاسم جنہوں

نے معتصم عباسی کے عہد میں طالقان کو مرکز بنا کر خروج کیا تھا اور بارہ مشہور اماموں میں حضرت موسیٰ کاظم امام جعفر صادق ان کے صاحبزادے اسماعیل بن جعفر سب ہی کے متعلق ابن حزم نے لکھا ہے کہ ماننے والوں کا یہی خیال[1] ہے کہ وہ زندہ ہیں اور جب تک دنیا کو عدل و انصاف سے نہ بھریں گے۔ زندہ رہیں گے۔

الغرض شخصی نامزدگی کے سیاسی اصول کو مان کر مختلف بزرگوں، کو مختلف زمانوں میں لوگ حکمرانی کے لیے جو اٹھاتے رہے اور جو امیدیں باندھنے والوں نے ان کی ذات کے ساتھ خواہ مخواہ باندھ رکھی تھیں۔ جب وہ پوری نہ ہوئیں تو "حیاتِ جاوید" یا امر ہونے کا نظریہ انہوں نے پیدا کر لیا، اسی شخصی نامزدگی ہی کی پیداواروں میں سے غالباً ایک خیال وہ بھی ہے جس کا ذکر ابن حزم نے تفصیل سے کیا ہے یعنی بارہ اماموں کے نظریہ والوں کے نزدیک ایک شخص سے دوسرے شخص تک حکومت کا استحقاق منتقل ہوتے ہوئے جب حضرت حسن عسکری گیارھویں امام تک نوبت پہنچی تو جیسا کہ ابن حزم اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ بظاہر آپ کے بعد کوئی اولاد آپ کی دنیا میں باقی نہ تھی لیکن آپ کے ماننے والوں میں سے :۔

[1] عجیب بات ہے کہ حسینی سادات ہی کے ایک ہندی خانوادہ میں سے حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سکھوں کے مقابلہ میں جہادی مہم پنجاب میں جو انجام دی اور بعض سرحدی پٹھانوں کی بے وفائی آپ کی شہادت کی وجہ ہوئی آپ کے متعلق بھی آپ کے عقیدتمندوں میں سے بعضوں کا زمانہ تک یہی خیال رہا کہ وہ زندہ ہیں اور واپس آکر پھر اپنی مہم کی تکمیل فرمائیں گے۔ ۱۲

"بعضوں نے تو مشہور کیا کہ ایک بیٹا آپ کا پیدا ہُوا جسے دشمنوں کے خوف سے آپ نے چھپا دیا۔ اور بعض مدعی ہُوئے کہ آپ کی شرعی کنیز حاملہ تھی اور وفات کے بعد وہ لڑکا جنی۔"[1]

ابن حزم نے لکھا ہے کہ :۔

"اس لونڈی کے نام میں ہی لوگوں کا اختلاف ہے کوئی کہتا ہے کہ اس کا نام نرجس (نرگس) تھا اور کسی کا دعویٰ ہے کہ سوسن نام تھا عام خیال ہے کہ صیقل اس کا نام تھا۔"

ابن حزم ہی کا بیان ہے کہ :۔

"اسی صیقل نامی کنیز نے آپ کی وفات کے بعد استقرار حمل کے دعوے کا اعلان کیا اور مقارمہ حکومت میں سات سال تک میراث کا چلتا رہا۔ امام حسن عسکری کے بھائی جن کا نام جعفر بن علی تھا، وہ اس کنیز کے دعویٰ کے مقابلہ میں اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے۔ حکومت کے لوگوں میں کچھ لوگ جعفر کے ہمنوا اور ہمدرد تھے اور کچھ لوگ صیقل کی سرپرستی کر رہے تھے۔ لیکن آخر میں فیصلہ جعفر ہی کے دعویٰ کے مطابق ہُوا۔

ابنِ حزم نے اس سلسلہ میں بعض دلچسپ باتوں کا ذکر کیا ہے[1]۔

[1] بیان کیا ہے کہ حسن عسکری کے ان صاحبزادے کے متعلق بعضوں کا خیال تھا کہ والد کی زندگی ہی میں پیدا ہوئے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان کی وفات کے بہت زمانے کے بعد ولادت ہوئی اور اسی خاندان کی ایک خاتون جن کا نام حکیمہ تھا اور محمد بن علی رضا بن موسیٰ کاظم کی جو بیٹی تھیں ان ہی (باقی صفحہ ۲۵)

بہر حال شخصی نامزدگی کے نظریہ والوں میں جیسا کہ آپ سُن چکے ہیں۔ تقریباً ہر اس شخص کے متعلق جن کے نامزد ہونے کا دعویٰ کیا گیا۔ اُن کی وفات کے بعد بھی لوگ اُن کو زندہ ہی تصور کرتے رہے۔ لیکن اوروں کے متعلق تو بہ تدریج یہ خیال مضمحل ہوتے ہُوئے تقریباً کچھ فراموش

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۴

کا بیان تھا کہ یہ بچہ میرے سامنے پیدا ہُوا، قابلہ کا کام میں نے ہی انجام دیا تھا۔ بیان کرتی تھیں کہ یہ پیٹ سے نکل کر بچہ جوں ہی میرے ہاتھ میں آیا تو دیکھا کہ قرآن کی تلاوت کر رہا ہے ص ۱۳۸ ج ۳۔ دوسری جگہ اسی کتاب میں ابن حزم نے لکھا ہے کہ سیدنا حسن عسکری کی شرعی کنیز جس کا نام نرگس یا صیقل یا سوسن بتایا جاتا ہے بیس سال تک امام حسن عسکری کی وفات کے بعد عباسی حکومت کے ایک منشی حسن بن جعفر نوبختی نو مسلم کے مکان میں یہی عورت رہی عباسی خلیفہ معتضد سے لوگوں نے شکایت کی، کہ یہ بڑے شرم کی بات ہے آخر بیس سال کے بعد معتضد کے حکم سے یہی عورت قصر خلافت میں بلا لی گئی اور وفات تک اسی شاہی قصر میں رہی وفات اس کی مقتدر باللہ کے زمانہ میں ہوئی۔ ابن حزم نے لکھا ہے ۲۶۰ھ میں امام حسن عسکری کی وفات ہوئی اس وقت سے ان کے صاحبزادے کے خروج کا انتظار بارہ اماموں کے ماننے والے کر رہے ہیں۔ ان ہی کو "المہدی المنتظر" کہتے ہیں گویا ایک ہزار سال سے زیادہ مدت انتظار ہی میں گزر رہی ہے۔ خود اپنا خیال ابن حزم کا یہ ہے کہ لم یعقب الحسن المذکور لا ذکرا ولا انثی ص ۱۳۸ ج ۳۔ یعنی امام حسن عسکری نے اپنے بعد نہ کوئی لڑکا چھوڑا اور نہ لڑکی اور ان کے بعد شرعی کنیز کے اس بچہ کا قصہ یوں ہی گھڑ لیا گیا تھا۔ حکومت کا فیصلہ بھی یہی تھا اس لئے وراثت حسن عسکری کے چچا جعفر بن علی کو دلائی گئی۔ ۱۲

ہی سا ہو گیا، صرف ان ہی بارھویں امام "المہدی المنتظر" کے متعلق امامیہ فرقہ اب تک خروج کے انتظار میں ہے، ہزار سال سے زیادہ مدت گذر چکی ہے لیکن انتظار کی گھڑیاں ختم نہیں ہو رہی ہیں۔ ان لوگوں کی طرف سے عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں میں عام طور پر خضر اور الیاس نامی بزرگوں کو مانا جاتا ہے کہ ہزارہا ہزار سال سے زندہ ہیں تو ان ہی کے ساتھ ایک اور ہستی کا اضافہ اگر ہو گیا تو لوگوں کو اعتراض کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے ابن حزم نے اُن کے اس عذر پر بحث کی ہے، جس کیلئے اصل کتاب کو پڑھنا چاہیئے۔

باقی شخصی نامزدگی کے اصول کے جو قائل نہ تھے اور حکومت کیلئے حکمران کے انتخاب کا حق ان کے نزدیک عام مسلمانوں کا حق ہے ان میں بھی اس سوال پر کہ کیا یہ حق ہر ہر مسلمان کا ہے یعنی جب تک زندہ مسلمانوں میں سے ہر ایک کی رائے کا علم نہ حاصل ہو اس وقت تک انتخاب جائز نہیں ہو سکتا، یا مسلمانوں کے کسی خاص طبقہ کے انتخاب سے انتخاب صحیح ہو جاتا ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں نے ہر ہر مسلمانوں کا آئینی حق اس کو قرار دیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ہر ہر مسلمانوں تو بڑی بات ہے تمام دنیا کے مسلمانوں کے ارباب علم و فضل کی رائے کا دریافت کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ:۔

" ملتان اور منصورہ یعنی (سندھ) سے مہرہ (حضرموت)

-- اور عدن تک کے اہل علم و فضل سے شروع کر کے مغربی افریقہ کے دور دست علاقوں جن میں طنجہ اشبونہ تمام سمندری جزیروں اور شام دار بینہ جبال قبیح اور اسبیجاب (یعنی ترکستان) فرغانہ اشروسنہ الغرض خراسان کے آخری حدود جوزجان سے لے کر کابل تک درمیان میں جتنے شہر جتنے قصبے اور دیہات ہیں، کیا ان سب کے متعلق رائے دریافت کرنے کی اس مہم میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

(ص ۱۲۹ ج ۴)

ابن حزم کے زمانہ یعنی پانچویں صدی ہجری میں اسلامی علاقہ کا جغرافیہ یہی تھا۔

بہرحال اسی لئے بعض لوگوں نے دار الحکومت کے ارباب حل وعقد تک انتخاب کے اس حق کو محدود رکھا ہے اس کے سوا بھی بہت سے نظریے پیش کئے گئے لیکن جب تک سیاسی اقتدار کے مالک مسلمانوں میں عرب رہے عربی قبائل ہی تک حکمرانی کے مسئلہ کو انہوں نے محدود رکھا اور اکثریت کا رجحان یہی رہا کہ جب تک ممکن ہو، قریش کے عربی قبیلہ ہی سے امام کا انتخاب کرنا چاہیئے، علامہ تفتازانی نے شرح مقاصد میں لکھا ہے کہ علاوہ ان آثار و احادیث کے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ قریش ہی کو ترجیح دینے کا حکم دیا گیا تھا، یوں بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ:۔

" نسب اور خاندانی شرافت کے متعلق عموماً دیکھا جاتا ہے

کردوں میں خاص قسم کی غیر معمولی عظمت پائی جاتی ہے۔ اور مختلف خیالات اور پراگندہ افکار کو ایک نقطہ پر جمع کرنے کے لئے عام طور پر نسبی شرافت موثر ذریعہ ثابت ہوئی ہے۔"

علامہ نے آگے بیان کیا ہے کہ:۔

"قوموں کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ حکومت اور سیاسی اقتدار عموماً کسی خاص خانوادے میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے اسی لئے ایک خاندان سے منتقل ہو کر حکومت کسی دوسرے خاندان والوں کے ہاتھوں میں جب چلی جاتی ہے تو تاریخ کا ایک اسے غیر معمولی حادثہ اور واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔"

اپنے تمہیدی بیان کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ:۔

"نظر بوجوہ بالا قریش کو دیکھا جائے تو مسلمانوں میں ہمیشہ عزت و وقار کے مالک وہی لوگ رہے ہیں۔ رسالت بھی اسی قبیلہ پر ختم ہوئی اور قیامت تک باقی رہنے والا دین دنیا والوں کو قریش ہی کے ذریعہ ملا۔

اور یوں قریش ہی کو حکمرانی کا جائز حقدار شرعاً وعقلاً لوگ سمجھتے رہے لیکن جوں جوں عربوں کی سیاسی قوت اضمحلال کی شکار ہوتی چلی گئی اور غیر عربی نسلوں کے ہاتھوں میں اقتدار منتقل ہونے لگا تو ان کی طرف سے یہ کوشش ہونے لگی کہ قریش کی اس ٹھیکیداری کو ختم کیا جائے۔ اس حد

تک تو مان بھی لیا گیا تھا جیسا کہ تفتازانی نے لکھا ہے کہ:۔

"قریشی حکمراں اگر دیکھا جا رہا ہو کہ وہ فاسق و جبار ہے اور مجتہد ہونا تو درکنار دینی مسائل سے بھی جاہل اور ناواقف ہے تو ایسی صورت میں:"

بغیر کسی اختلاف کے یہ مان لیا گیا ہے کہ:۔

فلا کلام فی جواز تقلد القضاء وتنفیذ الاحکام واقامۃ الحدود وجمیع ما یتعلق بالامام من کل ذی شوکۃ۔

بغیر کسی اختلاف کے یہ مان لیا گیا ہے کہ جو بھی صاحب شوکت و اقتدار ہو وہ مسلمانوں کا قاضی بھی مقرر کر سکتا ہے۔ اور احکام کو نافذ کر سکتا ہے اور حدود کو قائم کر سکتا ہے الغرض وہ سارے اختیارات استعمال کر سکتا ہے جو امام کے اختیارات سمجھے جاتے ہیں۔

ص۲۷۲ شرح مقاصد

علامہ نے اسی کے ساتھ اس کی بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ ساری باتیں اس وقت ہیں جب معاملہ کلیتاً مسلمانوں کی مرضی اور اقتدار کا تابع ہو، لیکن:۔

عند العجز والاضطرار و استیلاء الظلمۃ والکفار الفجار وتسلط الجبابرۃ الاشرار فقد صارت الریاسۃ الدنیویۃ تغلبیۃ وبنت علیہا الاحکام

لیکن مجبوری اور ضعف کے زمانہ میں جب ارباب ظلم اور کفار فجار اور زور زبردستی کرنے والے برسر اقتدار آجائیں تو اس وقت دنیوی حکومت تغلبیہ حکومت بن جاتی ہے یعنی جو غالب آجائے۔ اور دینی

الدينية المنوطة بالامام	احکام جن کے نفاذ کے لئے امام کی ضرورت
ضرورة ۔	ہے وقت کے اسی حاکم کے ساتھ وابستہ ہو
[illegible] شرح مقاصد	جائیں گے۔

بہرحال عرب کے سیاسی اقتدار کے خاتمہ کے بعد مجبورًا مسلمانوں کو قریش کے متعلق اپنے سیاسی نظریہ میں ترمیم کرنی پڑی۔ شروع میں غیر عربی مسلمانوں کی طرف سے جب مطالبہ اقتدار کا پیش ہُوا تو اس سلسلہ میں یہاں بہت سے دلائل شرعی و عقلی پیش ہوتے رہے ان میں سب سے زیادہ دلچسپ سیاسی نظریہ تھا، جس کی طرف شاید ہی اس وقت تک کسی کا ذہن منتقل ہُوا ہوگا۔

حکومت کے اقتدار

کی مستحق ملک کی کمزور پارٹی ہے

مطلب یہ ہے کہ قریش اپنی وجاہت اپنی تاریخی عظمت اپنی شوکت و قوت کو اپنے استحقاق کے جواز کے سلسلے میں پیش کرتے تھے تو اس کے مقابلہ میں بعضوں نے یہ عجیب سیاسی نکتہ پیش کیا کہ جن لوگوں کو کسی وجہ سے عام لوگوں کی ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں یا تعداد کی وجہ سے وہ ملک میں قوی عنصر ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں تو ان ہی کے ہاتھ میں حکومت کے اقتدار کو بھی سپرد کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ملک کے کمزور عناصر اور بے پناہ باشندوں کے ساتھ ان کے جی میں جو کچھ آئے گا کریں گے۔ اور

حکومت جس کا اساسی مقصد ہی یہ ہے کہ ظلم و جور اور بے آئینی کا ازالہ کرے اس کے برعکس جور و ظلم کے بڑھانے میں ایسی حکومت مددگار بن جائے گی۔ اسی مقصد کو بنیاد بنا کر ان لوگوں کی طرف سے سیاسی نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ عربوں کے مقابلہ میں غیر عربی مسلمان ہی اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ حکومت کی قوت ان ہی کے ہاتھ سپرد کر دی جائے تاکہ وہ کمزوروں اور ضعیفوں کی پشت پناہی کر سکیں۔ مسلمانوں کے ایک فرقہ ضراریہ کا ذکر کرتے ہُوئے ان کے سیاسی نظریہ کا ذکر ان الفاظ میں شہرستانی نے جو کیا ہے کہ :۔

ان الامامة تصلح فی	حکومت کا استحقاق غیر قریشیوں کو بھی ہے
غیر قریش حتی اذا اجتمع	تاآنکہ اگر ایک قریشی اور ایک نبطی (غیر
قرشی و نبطی قدمنا	عربی مسلمان) حکومت کے امیدوار بن کر کھڑے
النبطی اذ ھو اقل عددا	ہوں تو ہم نبطی (غیر عربی) ہی کو ترجیح دینگے
و اضعف وسیلة ۔	کیونکہ غیر عربی اقلیت میں ہیں اور ذرائع
ص٥ ج ١ شہرستانی	بھی ان کے کمزور ہیں۔

اسی سیاسی نظریئے والے یہ بھی کہتے تھے کہ غلط کاری کی صورت میں اقلیت والوں سے چنے ہُوئے اس حکمراں قوت کے ہٹانے میں بھی زیادہ دشواری پیش نہ آئے گی۔ اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت ہی کے سپرد حکومت کا اقتدار کیا جائے اس کی ایک بڑی مصلحت یہ بھی ہے شہرستانی نے ان کا یہ قول یعنی فیمکننا خلعه (پس ہمارے لئے اس اقلیت والے

حکمراں کو ہٹانا ممکن ہوگا، جو نقل کیا ہے بظاہر اس کا یہی مطلب ہے، میں نہیں جانتا کہ "حکومت" کے سلسلہ میں اقلیت کی ترجیح کا نظریہ سیاست کی دنیا میں کبھی پیش ہوا ہو لیکن جو دلائل اور وجوہ ان کی طرف سے پیش کیے گئے ہیں۔ وہ مستحق توجہ معلوم ہوتے ہیں اور واقعی اگر اکثریت کے ساتھ حکومت کے فرائض میں "اقلیت" کی حفاظت بھی ہے تو یقیناً یہ سوچنے کی بات ہے اکثریت تو اپنی تعداد کی کثرت کی وجہ سے بذاتِ خود طاقت ور ہوتی ہے لیکن غریب "اقلیت" کیا کرے آخر اس کی حفاظت کی کوئی صورت تو "انسانی ضمیر" کو نکالنی چاہیئے۔

جمہوریت کے اس عہد میں بھی غریب "اقلیت" کے مصائب اور پریشانیوں کا کوئی حل نہیں نکل سکا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جمہوریت کے زمانہ میں "اقلیت" غریب کی مظلومیت اپنے آخری حدود کو پہنچ گئی ہے۔ اور حکومت کے اس گذرے ہوئے دور کو جس کا غلط نام شخصی حکومت رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے کسی دور میں کبھی کسی شخص واحد نے دنیا پر کبھی حکومت نہیں کی ہے۔ عموماً بادشاہوں نے دانشمند وزیروں اور دوسرے اعوان و انصار ہی کی مدد سے حکومت کی ہے، بہرحال نام کچھ بھی رکھ دیا جائے لیکن جہاں تک تاریخ کی شہادت ہے بادشاہوں کے عہد میں بھی "اقلیت" کے حقوق اتنی لاپروائیوں کے ساتھ کبھی نہیں کچلے گئے، جتنی بے دردی کے ساتھ آج جمہوری حکومتوں میں ان کو ٹھکرایا جا رہا ہے۔ اکثریت والے پہلے ہی سے طاقت و قوت والے ہوتے ہیں اور

حکومت کی باگ بھی جب ان ہی کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ تو جو کچھ وہ کرتے ہیں اس کا نظارہ موجودہ عہد کی جمہوری حکومت میں ہر جگہ کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ مسلمانوں کی جمہوری حکومت ہو یا غیر مسلم اقوام کی اس باب میں سب کا حال برابر ہے۔ اور جمہوری حکومت کی بنیاد جس اصول پر قائم ہے اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔

خیر میں کس قصہ میں الجھ گیا عرض کر رہا تھا کہ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ جو سنایا جاتا ہے اگرچہ یہ افسانہ افسانہ ہو چکا ہے۔ لیکن سنانے والے اس کو کچھ اس طرح سنا رہے ہیں کہ ابھی یہ فرقے باقی ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مسلمانوں میں اختلاف کی ابتدا، سیاسی قصوں سے ہوئی، بھلا بتایا جائے غریب مسلمان جو سیاست کے میدان ہی سے تقریباً نکل چکے ہیں۔ ان میں مذکورہ بالا سیاسی نظریات کے اختلافات کے ذکر کرنے والوں کے رہ جانے کی وجہ ہی کیا ہو سکتی ہے۔ دنیا کی سیاست کے موثر عنصر جب تک مسلمان تھے واقعہ تو یہ ہے کہ اسی زمانہ میں رفتہ رفتہ یہ سارے سیاسی فرقے ختم ہو چکے تھے لے دے کر اہلسنت والجماعت یا سُنیوں کے مقابلہ میں امامیوں یا شیعوں کا ایک فرقہ رہ گیا۔ جو پُرانے جھگڑوں کے ذکر کو سال کے خاص مہینوں میں یاد کر کے پھر بھول جاتا ہے اور سچ پوچھئے تو زیادہ تر مسلمانوں میں سیاسی فرقے اسی "شیعہ طبقہ" ہی میں پیدا ہوئے تھے۔ شہرستانی تک نے لکھا ہے کہ:۔

قال بعضهم ان نيفا وسبعين — بعضوں کا قول ہے کہ ستر سے کچھ اوپر

فرقة من فرق المذكورة في الخبر هو في الشيعة خاصة ج۲	فرقے جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے خاص کر کے شیعوں ہی میں پائے جاتے ہیں۔

اور آج بھی مسلمانوں میں سلیمانیوں، داؤدیوں، آغا خانیوں، دروزیوں وغیرہ نام کے فرقوں کا ذکر سننے میں کبھی کبھی آجاتا ہے تو کون نہیں جانتا کہ یہ کل کے کل شیعہ طبقہ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ ان میں ہر ایک اپنی قلت تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں قابل توجہ نہیں رہا ہے۔

پس واقعہ تو یہی ہے کہ تھے تو یہ سارے اختلاف سیاسی ہی اختلافات اور کچھ مختلف نظریات رکھنے والی سیاسی پارٹیاں ہی تھیں۔ لیکن زمانہ اور ماحول کے خاص حالات نے ان اختلافات میں مذہب کا رنگ اس لئے بھر دیا کہ ہر ایک اپنے نظریہ کی تائید میں عقلی و تجربی دلائل کے ساتھ کچھ نہ کچھ شرعی شہادتوں کے پیش نظر کرنے کا بھی اپنے زمانہ کے مذاق کے مطابق عادی نہ تھا[1]

---

[1] سیاسی نظریات کے ان اختلافات میں ایک اختلاف اس میں بھی تھا کہ حکومت کی کجرویوں اور غلط کاریوں پر تنقید کا حق عوام کو حاصل ہے یا نہیں۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ "المہدی المنتظر" کے ظہور امام کے خروج کے انتظار کرنے والوں نے توسط کر دیا تھا کہ جب تک امام کا ظہور و خروج نہ ہو، کسی قسم کی حکومت ہو اور جو کچھ بھی کر رہی ہو خاموشی سے کام لینا چاہیئے اور نظریہ تقیہ کی بناء میں جب جیسی تب تیسی کے مطابق "زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز" پر عمل پیرا رہنا چاہیئے۔ بعض لوگ صرف دل سے نفرت یا زیادہ سے زیادہ موقعہ دیکھ کر زبان (باقی صفحہ ۳۵ پر)

بہرحال سیاسی فتنوں، جھگڑوں، رگڑوں نے، افتراق و انتشار کے جن شراروں کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جن لوگوں نے بھڑکا دیا تھا۔ اس کی اجمالی داستان کے بعد اب آپ کے سامنے اسی مسئلہ کے دوسرے پہلو کو پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ فرقہ بندیوں کا طوفان اسلام کی ابتدائی صدیوں میں کیسے پھوٹ پڑا تھا اور رفتہ رفتہ چڑھنے کے بعد فتنوں کا یہ سمندر اتر کیسے گیا۔

فرقہ بندی کی دوسری بنیاد

میں نے عرض کیا تھا کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسلامی دائرے کے اندر لوگ فوج در فوج داخل ہو رہے تھے قدرتاً اپنے ساتھ اپنے آبائی رسوم، اور موروثی خیالات و عقائد کو بھی لائے اور گو انہوں نے اسلام کو قبول ہی اس لئے کیا تھا کہ تاریخی آلودگیوں سے اپنے موروثی ادیان کے پاک کرنے کی قدرتی کارگر شکل وہی ہو سکتی تھی جسے قرآن نے پیش کیا تھا۔

بَلْ جَاءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِينَ۔ (صافات)	بلکہ وہ (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سچائی لے کر آئے ہیں۔ اور اللہ کے بھیجے

(بقیہ حاشیہ) اور ظلم تک تنقید کے حق کو جائز قرار دیتے تھے لکھا ہے کہ عام محدثین کا خیال بھی یہی تھا۔ لیکن عام علماء اسلام تلوار تک اٹھا لینے کے قائل تھے جب معاملہ حد سے گذر رہا ہو۔ تفصیلات کے لئے مسلمانوں کے سیاسی خیالات پر بحث کرنے والی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ہوؤں کی وہ تصدیق کرتے ہیں۔

اسلامی پیغام کوئی نیا پیغام نہ تھا

یا اسی کے قریب قریب دوسرے الفاظ میں مسلسل اعلانات ہو رہے تھے، مطلب سب کا یہی تھا کہ خالق کائنات کے سچے نمائندوں کے پیغام کے صادق اجزاء اور صحیح عناصر پر تصدیق و توثیق کی مہر لگانے کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمی رسالت کا پیغام دے کر اٹھایا گیا ہے اپنے مخاطبوں کو خطاب کرکے مصدق لما معکم (یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت یہ ہے کہ تم لوگوں کے پاس جو سچائیاں پہلے سے موجود ہیں ان کی تصدیق کرنے والے ہیں) کے ساتھ ساتھ سورۂ فاتحہ کے بعد پہلی سورۂ بقرہ کی ابتداء ہی میں منجملہ دوسرے شرائط کے قرآن سے استفادہ کی ایک اہم شرط یہ بتائی گئی ہے کہ :۔

يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ	مانتے ہیں اس کو بھی جو تجھ پر اترا اور اسے
وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۔	بھی جو تم سے پہلے اتارا گیا۔

نیا دھرم، نیا دین، نئی بات سمجھ کر بدکنے والے قرآن اور محمدی پیغام سے جو بدکتے اور بھڑکتے تھے ان کو سمجھایا گیا ہے کہ :۔

أَفَلَمْ يَدَّبَّرُوا الْقَوْلَ	کیا وہ بات کو سوچتے نہیں کیا ان کے پاس
أَمْ جَاءَهُمْ مَا لَمْ يَأْتِ	کوئی ایسی چیز آئی ہے جو ان کے آباء اولین
آبَاءَهُمُ الْأَوَّلِينَ ۔	یعنی اگلی پشتوں کے باپ دادا کے پاس :

آئی تھی۔

اسلام کو مان کر اپنے آبائی پیشواؤں سے کوئی بچھڑتا نہیں ہے

اپنے بزرگوں اور تاریخی پیشواؤں سے بچھڑ جانے کا خطرہ خواہ مخواہ دلوں میں جو پیدا ہوگیا تھا۔ اس کا ازالہ کر دیا گیا اور بتایا گیا کہ لوگ اُلٹی بات سمجھ رہے ہیں قرآن کا مقصد تو یہ ہے کہ بچھڑے ہوؤں کو اپنے اگلے باپ دادوں کے صحیح دین اور دھرم تک کھینچ کر پہنچاؤ وہ توڑنے کے لئے نہیں بلکہ ہر قوم کو اُن کے واقعی صالح سلف سے جوڑنے ہی کے لئے نازل ہوا ہے بیعت کرنے والوں سے عہد لیا جاتا تھا کہ :۔

آمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلَائِکَتِہٖ وَ	مانا اللہ کو فرشتوں کو اللہ کی کتابوں کو
کُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ۔	اللہ کے رسولوں کو

اور اس کے ساتھ یہ ذمہ داری بھی قبول کرنی پڑے گی کہ :۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ	ہم کسی قسم کی تمیز سے کام نہ لیں گے۔ اللہ کے
رُسُلِہٖ ۔ (البقرہ)	ان پیغام پہنچانے والوں کے متعلق۔

یعنی سب ہی کو مانیں گے اور یقین کریں گے کہ ان میں جس نے بھی پہنچایا اس نے کائنات کے خالق کردگار اور مالک پروردگار ہی کا پیغام پہنچایا۔ خواہ زمین کے کسی علاقہ میں آیا ہو اور انسانی نسلوں میں سے جس نسل میں بھی اٹھایا گیا ہو، صرف اجمال ہی سے کام نہیں لیا گیا۔ بلکہ سارے بنی آدم

کو مخاطب بنانے کے لئے خطاب کی ابتدا، خاص وجوہ و اسباب کی بنا پر جس علاقہ کے باشندوں سے کی گئی[1]

— یعنی عرب کے رہنے والے گذرے ہوئے پیغام بروں میں سے جن بزرگوں کے کام یا کم از کم نام ہی سے ان میں جو مانوس تھے۔ ان کے ناموں کی تصریح کر کر کے بار بار قرآن منادی کر رہا تھا کہ تمام بیرونی آلائشوں سے پاک و صاف کر کے دین اور دھرم کی جو شکل الاسلام کے نام سے تمہارے سامنے پیش ہو رہی ہے۔ یہ وہی دین ہے جس کی وصیت نوحؑ کو ابراہیمؑ کو موسیٰؑ کو عیسیٰؑ کو کی گئی تھی، صحیح انجام تک پہنچنے کی سیدھی راہ انسانیت کے لئے پہلے بھی یہی تھی، اب بھی یہی ہے، آئندہ بھی یہی رہے گی اسی صراطِ مستقیم (سیدھی راہ) کی طرف بنی آدم کو بلانے والے خواہ کسی زمانہ میں آئے ہوں، کہیں آئے ہوں، سب انسانی برادری ہی میں پیدا ہوئے تھے، ان میں بعضوں کو بعضوں سے جدا کرنا، انسانی نسل کی وحدت کا انکار ہے، چند مانوس ناموں کے تذکرہ کے بعد فرمایا گیا ہے، کہ ان کے سوا اور بھی جو دینی پیشوا جہاں کہیں گذرے ہیں۔

---

[1] اسی وجہ سے اسی علاقے کی زبان عربی میں قرآن نازل ہوا مگر اسی کے ساتھ قرآن ہی میں کہہ دیا گیا ہے کہ عربی و عجمی کے قصوں کو صرف نہ ماننے والے بہانہ بناتے ہیں ورنہ ایمان کی تلاش جن میں ہے ان کے لئے ہر حال میں یہ کتاب ہدایت و شفا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔ ءَاَعْجَمِیٌّ وَّعَرَبِیٌّ قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًی وَّشِفَآءٌ (حم سجدہ) یعنی عربی یا غیر عربی، کہہ دو کہ انہوں نے مان لیا ان کے لئے یہ کتاب راہنمائی بھی ہے اور (روگوں سے) شفا بخشتی ہے۔

وَمِنْ اٰبَآئِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَاِخْوَانِهِمْ وَاجْتَبَیْنٰهُمْ وَهَدَیْنٰهُمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (الانعام)

وہ ان ہی کے باپ دادا تھے یا ان ہی کی اولاد میں تھے یا ان کے بھائیوں میں تھے۔ ہم نے ان کو چن لیا اور راہنمائی کی ہم ہی نے ان کی سیدھی راہ کی طرف

مذہبی پیغام لانے والوں میں قرآنی رشتہ

جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ جن کا قصہ بیان کیا گیا اور جن کا نہ بیان کیا گیا مگر انسانیت کے صحیح انجام تک پہنچانے والی اس سیدھی راہ (صراطِ مستقیم) کی طرف جن کی راہنمائی کی گئی اور انہوں نے دوسروں کو اسی راہ کی طرف بلایا، کم از کم ان سب میں اخوت اور برادری کا تعلق تھا اسی لئے ایرین نسلوں والے ہوں یا سامی خانوادہ والے، یا ان کو مٹیرین (ترکی و تاتاری) گوت میں شمار کیا جاتا ہو، خواہ انکی پیدائش عرب میں ہوئی، یا شام میں، مصر میں ہو۔ یا عراق، ہند میں ہو یا سندھ میں، چین میں ہو یا جین میں صراطِ مستقیم پر یہ سارے چلنے والے اور چلانے والے باہم ایک دوسرے کے بھائی اور اخوان قرآن کی رُو سے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ بھی تھا کہ گذرے ہوئے پیغمبروں میں سے جب کسی کا نام لیتے، تو عموماً بھائی (اخ) کا لفظ استعمال فرماتے۔ معراج والی حدیث میں بھی ہے کہ آبائی رشتہ جن ملنے والے پیغمبروں سے آپ کا نہ تھا وہ آپ کا استقبال مرحبا بالاخ الصالح کے الفاظ میں کرتے تھے۔

اسی موقعہ پر سورۃ الانعام میں جہاں انبیاء ورسل علیہم السلام کے درمیان ابوت و نبوت و اخوت کے رشتوں کا قرآن نے اعلان کیا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں ہی کو نہیں بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے مطالبہ کیا گیا ہے کہ :۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ	یہی وہ لوگ ہیں جن کی راہ نمائی اللہ نے
فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۔	کی، پس ان ہی کی ہدایت کی پیروی تو بھی کر

رشتہ داری کے تعلقات ہاں پھر بھی گونہ غیریت گویا رہ جاتی ہے اسی غیریت کا خاتمہ "هُدٰى" کی وحدت و عینیت کا اعلان کرکے کر دیا گیا، اجمال کے ساتھ ساتھ تفصیلی قوانین کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بھی سنایا جاتا تھا کہ :۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ	خدا چاہتا ہے کہ تم سے پہلے جو گذرے ہیں
يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ	ان کے طور اور طریقوں کی طرف تمہاری
قَبْلِكُمْ ۔ (النساء)	راہ نمائی کرے۔

زبان سے بھی یہی کہا جاتا تھا، عمل کرکرکے بھی اس کو دکھایا جاتا تھا موسیٰ علیہ السلام کو پیشوا ماننے والوں کو دیکھا گیا کہ عاشورہ کے دن جشن منا رہے ہیں وجہ پوچھی جاتی ہے جواب ملتا ہے کہ اسی دن فرعون سے موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو نجات ملی تھی۔ سننے کے ساتھ قرآن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

انا احق بموسیٰ منکم	میں حضرت موسیٰ (کی خوشی میں شرکت)
(بخاری)	کا تم سے زیادہ حق دار ہوں۔

مسلمانوں کا اہلِ کتاب سے رشتہ

اپنے آباء اولین[1] سے نسبتاً جو زیادہ دور نہ ہوئے تھے، مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان لانے والے عیسائی جن کے پیغمبر نزولِ قرآن سے تقریباً پانسو سال پہلے گذرے تھے یا ان سے چند صدیاں پہلے موسیٰ علیہ السلام تھے جن کو یہود اپنا پیغمبر مانتے تھے، ان مذہبی جماعتوں کے اندر حالانکہ بعض ناقابلِ عفو اعتقادی و عملی کمزوری شریک ہو چکی تھیں لیکن باوجود اس کے ان میں ان سچائیوں کی بھی کافی اور معقول مقدار نسبتاً زیادہ محفوظ تھی۔ جنہیں خالقِ کائنات کی طرف سے حضرت عیسیٰ اور موسیٰ علیہما السلام نے

[1] اس کو یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن ہی میں مختلف مواقع پر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ ان کو چونکانا مقصود ہے جن کے آباء (باپ دادا) چونکائے گئے یعنی لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ وغیرہ جیسی آیتوں میں صرف آباء کا لفظ ہے جس سے مراد قریب کی گذشتہ پشتیں ہیں اور جہاں یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارے باپ دادوں کو جو کچھ دیا گیا تھا کیا اس کے سوا اب دیا جا رہا ہے۔ یہاں آباء کے ساتھ اولین کا لفظ ہے نزولِ قرآن کے زمانہ میں عموماً بنی آدم کی تمام نسلیں چند پشتوں سے بدترین جہل و عبادت و ضلالت کی شکار ہو چکی تھی یہی وہ پشتیں تھیں جن کے متعلق قرآن مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ کہتا ہے یعنی وہ چونکائے نہ گئے"، ورنہ تاریخی طور پر ہر قوم کے قدیم اسلاف کے پاس خدا کا پیغام آیا تھا اور قدیم اسلاف یا آباء اولین کے اسی پیغام کو قرآن کے ذریعہ سے تروتازہ کیا گیا نئی زندگی بخشی گئی۔ ۱۲

ان تک پہنچائی تھی۔ فرسودہ تاریخ رکھنے والی قوموں کے مقابلہ میں ان عیسائیوں اور یہودیوں کے دین کی تاریخ زیادہ غت ربود نہیں ہوئی تھی جہاں تک میرا خیال ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن پر ایمان لانے والوں کے لیے ان دونوں دینی امتوں سے ازدواجی رشتہ قائم کرنے کا دروازہ یہ حکم دے کر کھول دیا گیا کہ ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں خواہ اپنے دین کی تصحیح وتطہر کے لئے قرآنی ہدایات پر ایمان لانے کی سعادت سے یہ کتابیہ عورتیں محروم ہی کیوں نہ ہوں۔

مصلحت اندیشیوں پر اسلامی دین کی بنیاد اگر قائم ہوتی تو رشتہ داری کے اس دروازے کے کھلے رکھنے کی خود سوچنا چاہیئے کیا گنجائش پیدا ہو سکتی تھی؟ مسلمانوں کے گھروں میں ان دینی اقوام کی عورتوں کے گھسنے کی اجازت میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ قطعًا غیر مآل اندیشانہ فعل ہوتا اگر اسلام بجائے دین کے صرف سیاسی کاروبار کے انجام دینے کا خدانخواستہ کوئی حیلہ اور بہانہ ہوتا سیاسی کش مکش ان دینی قوموں سے نزولِ قرآن ہی کے عہد میں حالانکہ شروع ہو چکی تھی، لیکن اس کی پرواہ کئے بغیر دینی مناسبتوں پر جو اجازت مبنی تھی، اس اجازت میں کسی قسم کی ترمیم پر قرآن آمادہ نہ ہُوا کہ اس کے سامنے صرف دین تھا۔ توثیق وتصحیح اور قدرے تکمیل کے نصب العین کو دنیا کے سارے مذاہب وادیان کے سامنے قرآن نے جو رکھا تھا اس نصب العین سے استفادہ کی صلاحیت اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کے دین میں چونکہ واقعہ کے لحاظ سے زیادہ پائی جاتی تھی۔ دوسروں کے لحاظ سے وہ زیادہ،

قریب تھے اس لئے سیاسی خطرات اور اندیشوں کی پرواکئے بغیر اس قانون کو باقی رکھا گیا۔ اور وہ آج تک باقی ہے۔ اور یہی ایک دروازہ نہیں کھان پان میں بھی مسلمانوں کو قرآن نے اہل کتاب سے اور اہلِ کتاب کو مسلمانوں سے قریب رکھنے کی جو کوشش کی ہے وہ بھی اسی نصب العین ہی کا اقتضا رہے[1]

یہود ونصاریٰ کے سوا دوسری دینی قوموں کے ساتھ صحابہؓ کا طرزِ عمل

بلکہ قرآن جن لوگوں میں نازل ہو رہا تھا۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے براہِ راست قرآنی نصب العین کے سمجھنے کا موقعہ جنہیں ملا تھا، میری مراد حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ہے، عرب سے باہر نکلنے کے بعد ان کے سامنے جب ایسی قومیں آئیں جن کی دینی تاریخ ماضی کے

[1] یہ سوچنے کی بات ہے کہ قرآن کو خدا کا حکم مان چکے تھے یعنی مسلمان ان کو تو قرآن اپنے حکم کا مکلف بنا سکتا تھا لیکن کھان پان کے مذکورہ بالا قانون کے الفاظ ہیں" طَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ (یعنی جنہیں کتاب دی گئی ان کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے حلال ہے اس میں دوسرا جز (یعنی مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لئے حلال ہے) یہی غور طلب ہے قرآن کو اہل کتاب اللہ کی کتاب ہی جب نہیں مانتے تو ان کو مکلف بنانے کی غرض کیا ہو سکتی ہے۔ منجملہ دوسرے وجوہ کے میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے کہ مسلمانوں کو جیسے قرآن اہل کتاب سے قریب کرنا چاہتا ہے اسی طرح اہل کتاب کو بھی مسلمانوں سے قریب کرنے کیلئے یہی پیرایہ تعبیر اس نے اختیار کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

دھندلکوں میں تقریباً غروب ہوچکی تھی کم ازکم اہل کتاب کے دین کی تروتازگی کی کیفیت ان میں باقی نہ رہی تھی، تاہم آثار وقرائن بتاتے تھے کہ آسمانی سچائیوں سے وہ بھی مانوس ہیں، توجس حدتک تاریخی نشانات اور آثار کا اقتضار تھا، یا ہوسکتا تھا۔ ——————

—— صحابہ کرام نے تاریخ کی ان شہادتوں سے لاپروائی نہیں برتی۔ ایران کے مجوسیوں کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے مسلمانوں کے تعلقات کی نوعیت کو منقح کرتے ہوئے ان ہی تاریخی آثار کا حوالہ دیا، فرمایا گیا تھا کہ ان کے پاس بھی صحیح دین اور آسمانی کتاب تھی، دست برد زمانہ نے گو اُن کی دینی زندگی میں بیرونی آلائشوں کو شریک کردیا ہے لیکن ان کا حال ان جنگلی قوموں کا نہیں ہے، جو جنگلوں میں حیوانوں کی زندگی بسر کرتے ہیں اور کسی قسم کے آئین و دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے[1]۔

[1] تفصیل کے لئے مطولات کا مطالعہ کرنا چاہیئے، مجوس ہی نہیں بلکہ عام فقہا اسلام نے اس کا حق کہ آئینی معاہدہ کرکے اسلامی حکومت کی حفاظت کے دائرے میں شریک ہونے کے لئے۔ اور اس معاہدے کے بعد اسلامی حکومت ان کی جان اور مال عزت و آبرو کی ذمہ دار بن جاتی ہے، تقریباً اس رعایت میں ان ساری قوموں کو داخل کرلیا ہے جو اپنے پاس مجوسیوں اور ایرانیوں کی طرح کسی نہ قسم کی دینی تاریخ رکھتی تھیں اور گو جمہور فقہا اس فیصلہ میں ابن حزم کے مخالف ہیں لیکن اس شخص نے تو مجوس کے متعلق ان سارے حقوق کا دعویٰ کیا ہے جو اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کو اسلامی دین میں حاصل ہیں دوسرے دلائل کے ساتھ اپنی تائید میں بعض صحابہ کے طرز عمل کو بھی ابن حزم نے پیش کیا ہے لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی جن کا نام

باقی صفحہ ۴۵ پر

کچھ بھی ہو قدر مشترک کے طور پر اتنی بات بہرحال سمجھ میں آتی ہے، کہ قرب وبعد، یا نزدیکی و دُوری کا تعلق خونی رشتوں سے وابستہ کرنے کا جو عام رواج ہے اس کے مقابلہ میں دینی اور مذہبی قوموں کے ساتھ اسلام نے رشتہ کا معیار بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بجائے خون وغیرہ کے ہر قوم کے دین کی تاریخی نوعیت کو ٹھہرایا ہے جن کے دین کی تاریخ نسبتاً فرسودگی و کہنگی کے عوارض سے جتنی زیادہ پاک ہے ان سے اسی حدتک مسلمانوں کو قرآن نے قریب رہنے کا نقطۂ نظر پیش کیا اور سیاسی یا معاشرتی، کلچری وغیرہ اغراض کے لحاظ سے نتائج کچھ بھی ہوں، لیکن قوموں کو اپنے اپنے آبائی ادیان اور دھرموں کی تطہیر و تزکیہ کے مواقع اس رشتہ سے چونکہ فراہم ہوسکتے ہیں، اس لئے بین الاقوامی تعلقات میں رشتہ ناطے کے اس عجیب و غریب باب

(بقیہ حاشیہ) "سابروخت"، تھا حسن بصری کا قول نقل کیا ہے کانت امراۃ حذیفہ مجوسیۃ ج۹ ص۴۴۹ محلی۔

برہما اور ابراہیم | اور مشہور قرآنی آیت یعنی انی جاعلک للناس اماما (میں تم کو سارے انسانوں کا پیشوا بناؤں گا) اس کا وعدہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو کیا گیا تھا شاید اسی وجہ سے بعض علماء اسلام مثلاً عبدالکریم جیلی وغیرہ ہندوستان کے براہمہ یعنی برہمنوں کو سمجھتے ہیں کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کے نام کی طرف نسبت ہے اور ہندی برہما ابراہیم کے لفظ کا ہندی تلفظ ہے اسی طرح شہرستانی نے ایران والوں کے متعلق لکھا ہے کہ کانت ملوک العجم کلھا ملۃ ابراھیم ج۲ ص۵۴ - ملل ونحل یعنی ایران کے سلاطین ابراہیمی ملت پر تھے لکھا ہے کہ الناس علی دین ملوکھم کے عام قاعدہ کے رو سے ایران کے باشندوں کی عمومیت کے متعلق یہی سمجھنا چاہیئے کہ ان کے دین کا تعلق بھی ابراہیم علیہ السلام ہی سے تھا۔

کو اسلام نے کھول دیا۔ عہدِ صحابہ ہی سے اس پر عمل درآمد شروع ہوا اور بعد کو بھی کھلا ہی رہا۔

اس راہ میں عملی شہادتوں کا جو ذخیرہ کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ عہدِ نبوت میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کے ساتھ مسلمانوں کے میل جول کے جن واقعات کا سراغ دوسری روایتوں کے ضمن میں جو ملتا ہے، خود دربارِ رسالت میں ان دینی قوموں کے افراد کی آمد و رفت سوال و جواب، بات چیت، ظرافت و طیبت کے جن قصوں کا صحابہ تذکرہ کیا کرتے تھے یا سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس ان کے ہاں جس بے تکلفی کے ساتھ آتے جاتے تھے اگر ان سارے واقعات کو اور ان کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل کو کوئی جمع کرنا چاہے تو ایک اچھی خاصی کتاب ہی اس مواد سے بن سکتی ہے۔

حضرت عمرؓ والی روایت تورات کے متعلق

اب لوگوں کو کیا کہیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق ایک روایت جو نقل کی جاتی ہے کہ تورات کا کوئی حصہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنے لگے کہ:۔

اخذتہا من اخ لی من بنی زریق (جمع الفوائد ص۱۸)

بنی زریق (یہودی خاندان) سے تعلق رکھنے والے اپنے ایک بھائی سے مجھے یہ ٹکڑا تورات

کا ملا ہے۔

کہتے ہیں کہ جس خاص طریقہ سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس واقعہ کا ذکر کر رہے تھے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے باعثِ گرانی ہوا تھا۔ جس کی معافی بھی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی وقت چاہ لی تھی۔ عام طور پر لوگوں نے اس روایت کو تو مشہور کر دیا، عموماً اس کا چرچا بھی کرتے ہیں حالانکہ سنداً جیسا کہ خود جمع الفوائد کے مصنف نے بھی آخر میں تنبیہ کی ہے کہ سند میں اس روایت کے ابوعامر القاسم بن محمد الاسدی راوی ہے جس کے متعلق کچھ نہیں معلوم کہ کون ہے اور اس کی روایت کس حد تک قابلِ بھروسہ ہو سکتی ہے علاوہ اس کے کون کہہ سکتا ہے ناگواری کا سبب کیا تھا۔ ایسی کتاب جس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہو کہ "فیہ ھدی و نور" (اس میں راہ یابی اور روشنی ہے) اس کتاب کا کوئی حصہ تو قطعاً باعثِ ناگواری نہیں ہو سکتا یہ خیال کہ بنی زریق کے اس آدمی کو جس سے تورات کا یہ حصہ حضرت عمرؓ کو ملا تھا اس کو بھائی کہنے کی وجہ سے برہمی کی صورت پیش آئی، ناقابلِ توجہ ہے۔ قرآن ہی نے "دینی اخوت" کا دروازہ کتابیوں، اور مسلمانوں کے درمیان کھولا تھا وہی برہمی کی وجہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں روایت میں حقیقت کا کچھ حصہ بھی اگر مان لیا جائے کہ شریک ہے۔ تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ جہاں مسلمانوں اور دنیا کی دوسری دینی قوموں کے درمیان ان کے دین کے خصوصی حالات کی بنیاد پر اسلام دینی رشتہ اور اخوت کا تعلق قائم کرنا چاہتا ہے وہیں پوری قوت کے ساتھ تطہیر و

تزکیہ کے اصلاحی نصب العین کو بھی چاہتا ہے کہ نگاہوں سے ہٹنے نہ پائے۔ کیونکہ اس کے بعد تو نزولِ قرآن کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ بیرونی آمیزشوں اور من مانی آلائشوں سے ادیان و مذاہب کو پاک کرنا۔ اور اپنے اپنے ابار اوّلین کی صحیح تعلیم تک واپسی کا موقعہ ہر قوم کے لئے فراہم کرنا۔ یہی تو قرآن کے نزول کا سب سے بڑا مقصد ہے ہلکی سی لاپروائی اور اس جوہری نصب العین سے معمولی بے توجہی بھی فاحش اغلاط کی بقار کی ضمانت بن سکتی ہے۔

توراۃ کے ساتھ مسلمانوں کے تعلق کی نوعیّت

اسلام کا ابتدائی زمانہ تھا ضرورت تھی کہ ہلکے سے ہلکے خطرے کا شروع ہی میں انسداد کر دیا جائے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرزِ عمل کی تہ میں کچھ اس قسم کے اسباب پوشیدہ نہ تھے، آخر ایک طرف جہاں اس روایت کا چرچا کیا جاتا ہے، وہیں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں اس کا اطمینان تھا کہ پڑھنے والے کے سامنے سے تطہیر و تزکیہ کا نقطۂ نظر کسی حال میں اوجھل نہ ہوگا، وہاں یہی نہیں کہ منع نہیں کیا گیا بلکہ حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے یہ عرض کرنے پر کہ میں نے توراۃ بھی پڑھی ہے اور قرآن بھی؟

عبداللہ بن سلام کو قرآن کے ساتھ توراۃ کی اجازت دیگئی

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جیسا کہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں نقل کیا ہے یہ حکم دیا کہ:-

اقرء هذا ليلة وهذا الليلة — ایک رات یہ پڑھو اور ایک رات وہ

(تذکرۃ الحفاظ ذہبی ص ۲۶)

عبداللہ بن عمروؓ صحابی اور توراۃ

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ صحابہ اور ان کے بعد تابعین کے زمانہ میں بھی اربابِ ذوق تطہیری نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس ارشاد نبوی سے اٹھاتے رہے صحابیوں میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خاص طور پر اس باب میں شہرت حاصل تھی[1]۔
ابن سعد نے طبقات میں نقل کیا ہے۔

ایک تابعی کا ختمِ قرآن اور ختمِ توراۃ

کہ تابعین میں ابوالجلا الجونی ایک ثقہ بزرگ تھے جو ایک ہفتہ قرآن کی تلاوت میں اور چھ دن توراۃ کے مطالعہ میں گذارتے دونوں کتابوں

[1] اصابہ وغیرہ میں تفصیلات دیکھئے۔

کو ختم کر کے دعار کی مجلس منعقد کرتے۔ کہتے کہ خدا کی رحمت کے نزول کے یہ خاص اوقات ہیں[۱]۔

حقیقت تو یہ ہے کہ قوموں کے موروثی ادیان کے ساتھ قرآن نے مسلمانوں کا جو تاریخی رشتہ قائم کر دیا ہے اس رشتہ کے اقتضاؤں کی تکمیل اس طریقہ سے کرنا کہ تطہیر و تزکیہ کے مذکورہ بالا نصب العین سے بھی آنکھ جھپکنے نہ پائے اگر سوچا جائے تو غیر معمولی نازک ترین ذمہ داری اسی کی وجہ سے مسلمانوں کے سر عائد ہو گئی ہے۔

بجائے اس کے بظاہر یہ کہیں زیادہ آسان معلوم ہوتا تھا کہ ایک قطعاً جدید انوکھے، نئے پیغام کی شکل میں اسلام کو دنیا کے عام مذاہب و ادیان کے مقابلہ میں پیش کر دیا جاتا۔ خصوصاً ایسی آیتیں مثلاً:۔

لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (آل عمران)

ہرگز تم سے نہ یہودی راضی ہو سکتے ہیں اور نہ نصاریٰ جب تک ان کی ملت کے تم پیرو نہ بن جاؤ۔

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ان دینی قوموں سے قرآن خواہ جتنا بھی قریب کرنا چاہتا ہو، لیکن مسلمانوں سے قریب ہونے پر دنیا کی یہ قومیں آمادہ نہ تھیں قریب ہونا کیا معنی بلکہ قرآن ہی صاف صاف کھلے لفظوں میں اس حقیقت کو بھی واشگاف کر رہا تھا کہ:۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً — تمام آدمیوں میں سب سے زیادہ سخت مسلمانوں کی

[۱] ابن سعد طبقات جز ہفتم حصہ اول صفحہ ۱۶۱

لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ (المائدہ) — دشمنی اور عداوت میں یہود کو پاؤ گے۔

لیکن گذشتہ ادیان و ملل کے ساتھ قرآن اور قرآنی تعلیم کا جو تاریخی رشتہ تھا، اس رشتہ کو توڑ لینے پر تو قرآن کیا آمادہ ہوتا وہ ان پرانے مذاہب کے ماننے والوں کے طرز عمل سے قطعاً بے پروا ہو کر اس رشتہ کو مضبوط اور استوار ہی کرتا چلا گیا اور اس سے بھی وہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ عقلی مصلحت اندیشیوں کا قرآنی دعوت میں خدا نخواستہ کچھ بھی دخل ہوتا تو عقل مشکل ہی سے اس عجیب و غریب طرز عمل کے باقی رکھنے کا مشورہ دے سکتی تھی۔ لیکن قرآن تو واقعات اور صرف حقائق کا شارح تھا۔

جس تاریخی رشتہ کا گذشتہ مذاہب و ادیان کے ساتھ وہ مدعی تھا۔ یہی جب واقعہ تھا تو اس واقعہ کے سوا آپ خود بتائیے آخر وہ ظاہر کیا کرتا۔

غیر مسلم اقوام خصوصاً اہل کتاب کے پیشواؤں کے ساتھ مسلمانوں کا طرز عمل

سچ پوچھئے تو قرآنی تعلیم کے اسی پہلو کا نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں نے ان کو بھی گلے لگایا، جو ان سے قریب ہونے کے لئے آگے بڑھے اور ان سے بھی وہ نزدیک ہی رہنے پہ اصرار کرتے رہے، جو ان سے بھاگتے اور بھڑکتے رہے۔ وہ مسلمانوں کی، مسلمانوں کے پیغمبر کی، مسلمانوں کی کتاب کی توہین کرتے رہتے، مضحکے اڑاتے رہے، لیکن مسلمان اس کے جواب میں ان کے پیغمبروں پر سلام ہی بھیجتے رہے ان کی کتابوں کا احترام ہی کرتے رہے ابتدار

اسلام سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا، یہودیوں کا جو جی میں آتا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کہتے رہتے ہیں۔ لیکن یہودیوں کے انبیاء اور پیشواؤں کو مسلمان علیہم السلام کی دعاؤں ہی کے ساتھ یاد کرتے ہیں بلکہ داؤد و سلیمان جنہیں یہودی صرف اپنے سلاطین اور بادشاہوں میں شمار کرتے ہیں لیکن علیہ السلام کے اضافہ کے بغیر ان کا نام بھی مسلمان نہیں لیتے قرآن نے ان کو یہی سکھایا ہے اور یہود و نصاریٰ کے ساتھ تو عرض کر چکا ہوں، ان کا دینی رشتہ بہت زیادہ قوی ہے۔

یونانی فلاسفہ و اطباء کے ساتھ ان کا طرز عمل

یونان کے فلاسفہ سقراط و افلاطون ارسطو یا اطبار بقراط و جالینوس جیسی غیر دینی شخصیتوں کے متعلق لوگوں کو حیرت ہوتی ہے۔ جب مسلمانوں کی عام کتابوں میں پاتے ہیں کہ ان کا ذکر بھی کافی احترامی الفاظ میں کیا جاتا ہے خود ان کے نظریات ہی کو نہیں بلکہ جن نتائج تک یونانیوں کے طریقہ فکر کی روشنی میں مسلمان پہنچے ہیں اپنی کتابوں میں ان کا تذکرہ بھی اس طریقہ سے کرتے ہیں کہ گویا یونانی فلسفہ یا یونانی طب ہی کے مسائل ہیں۔ اچنبھا ہوتا ہے کہ باوجود استفادہ کے قوموں کی عام ذہنیت جہاں یہ ہے کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کو لوگ چاہتے ہیں کہ ان ہی کی طرف منسوب ہو جائے[1]۔ وہاں مسلمانوں میں اس کے برعکس یہ احترامی فراخ چشمیاں اور

[1] خصوصاً یورپ کے علمی حلقے تنگ نگاہی کے اس مرض کے بدترین شکار بنے ہیں (باقی صفحہ ۵۳ پر)

اعترافی رواداریاں کیوں اور کیسے پیدا ہو گئیں؟

ممکن ہے کہ اس کے اسباب کچھ اور بھی ہوں لیکن میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ یہ سب جو کچھ بھی ہے نتیجہ ہے قرآن کے اسی نقطۂ نظر کا جو دینی قوموں کے متعلق مسلمانوں کے اندر اس نے پیدا کر دیا ہے غیر دینی دائروں میں بھی ان کی اس موروثی عادت کے آثار اگر پائے جاتے ہیں تو جس قوم کی تربیت مسلمانوں کی اجتماعی نفسیات سے کی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کم از کم مجھے تو اس پر تعجب نہیں ہوتا۔ لیکن جیسا کہ عرض کر چکا ہوں۔

مسلمانوں کو چوکنا رہنے کا مشورہ

اس سلسلہ میں مسلمانوں پر جو ذمہ داری عائد ہو گئی ہے وہ حد سے زیادہ نازک ہے۔ بے احتیاطیاں افراط یا تفریط میں لوگوں کو مبتلا کرتی

(بقیہ حاشیہ) سارے عقلی اور ذہنی علوم و فنون، حتیٰ کہ شعر و ادب۔ آرٹس یورپ والوں تک مسلمانوں ہی کے ذریعہ پہنچا ہے۔ مسلمانوں کے توسط کے بغیر کسی علم یا فن کی صحیح تاریخی توجیہ ناممکن ہے لیکن یورپ کے اہل علم و قلم کا یہ التزام معلوم ہوتا ہے کہ غلطی سے بھی مسلمانوں اور ان کے خدمات کا ذکر ان کے زبان اور قلم پر آ ہی نہیں سکتا۔ ہزار سال کی طویل مدت سے چھلانگ مار کر ان میں ہر ایک یونان و روم پہنچ جاتا ہے اور سارے علوم و فنون کے شجرہ نسب کا سلسلہ قدیم علمی تاریخ کے ان ہی دونوں گہواروں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر اقبال کا شعر ہے عہد نو با جلوہ ہا آراستہ ۔ از غبارے پائے ما برخاستہ ۔ ہے تو یہ ایک ہی شعر لیکن مجلدات میں بھی جو تاریخ سما نہیں سکتی ان کے ان دو مصرعوں میں سب کچھ سمٹ گیا ہے۔

رہی ہیں اور تو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور ان صحابیوں کی صحبت میں تربیت پانے والے جس زمانہ میں موجود تھے اسی زمانہ میں ایسی صورت حال پیش آگئی تھی کہ حضرت عبداللہ بن عباس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جھنجھلا کر ایک دفعہ کہنا پڑا۔ امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں اس کو نقل کیا ہے یعنی عام مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے ایک دن ابنِ عباسؓ نے کہا :-

بخاری میں ابنِ عباسؓ کا قول

كيف تسئلون اهل الكتاب	مسلمانو! اہل کتاب سے تم کیسے پوچھتے ہو، حالانکہ
عن شئ وكتابكم الذى	تمہاری کتاب جسے اللہ نے اپنے رسول پر اتاری۔
انزل على رسوله احدث	(یعنی قرآن) تازہ ترین کتاب ہے (تم اس کتاب کو
تقرؤنه محضا لم يشب	اس طور پر پڑھ رہے ہو جو خالص حال میں ہے بیرونی
وقد حدثكم ان اهل الكتاب	آمیزش اس میں نہیں ہوئی ہے (اس کے مقابلہ میں
بدلوا كتاب الله وغيروه	خود قرآن میں اللہ تعالیٰ نے) تم کو خبر دی ہے، کہ
وكتبوا بايديهم الكتاب	اہل کتاب نے اللہ کی کتاب کو بدل دیا اور الٹ پلٹ
قالوا هو من عند الله	دیا وہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں اور کہتے ہیں
ليشتروا به ثمنا قليلا ه	کہ یہ اللہ کے یہاں کی کتاب ہے تاکہ حاصل کریں
ص ۱۰۹۴ - ج ۲	اس کتاب کے معاوضہ تھوڑے دام (یہ بھی قرآن ہی کی
(بخاری کتاب الاعتصام)	اطلاع ہے)

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کتاب سے میل جول پوچھ گچھ کے سلسلے

میں کچھ لوگ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ تطہیر و تزکیہ کے قرآنی نصب العین کے متعلق جس غیر معمولی بیداری اور چونک کی ضرورت ہے اس سے ان میں کچھ لاپرواہی سی ابن عباسؓ کو نظر آئی کہ پیدا ہو رہی ہے، اسی لئے انہوں نے قرآن کے اسی نصب العین کو ظاہر کرتے ہوئے فرمایا کہ آسمانی کتابوں کا یہ جدید آخری ایڈیشن ہے اور ایسا ایڈیشن ہے جو بیرونی آلائشوں سے قطعاً پاک ہے، برعکس اس کے اہل کتاب کی کتاب میں تغیر و تبدل سب کچھ ہو چکا ہے، چاہیئے تو یہ کہ اپنے مشکوک و مشتبہ نسخوں کی تصحیح و تطہیر قرآن پر پیش کرکے وہ کریں لیکن برعکس ان کے ان ہی مشکوک نسخوں سے بعض مسلمانوں نے قرآنی مضامین کو سمجھنا چاہا یہ ایک بڑا خطرناک اقدام تھا بلکہ قلب موضوع کی صورت تھی ابن عباس نے مسلمانوں کو شروع ہی سے اس معاملہ میں محتاط رہنے کا مطالبہ کیا۔ فرضی اللہ تعالیٰ عنہ

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رنگ و نسل، وطن اور زبان ہی نہیں بلکہ دینی اور مذہبی بنیادوں پر بھی بٹتی ہوئی قوموں کے لئے اسلام نے اپنے دروازے کو اس اعلان کے ساتھ جو کھول دیا کہ خواہ کسی رنگ کا آدمی ہو، کسی نسل کا ہو کہیں کا رہنے والا ہو جو زبان بھی بولتا ہو اور کسی دین سے تعلق رکھتا ہو، یہودی ہو، عیسائی ہو، مجوسی ہو، ان میں ہر ایک اسلام کی کتاب قرآن کو خدا کی کتاب مان کر اپنے اپنے صحیح آبائی دین کو ہر قسم کی غیر خدائی آمیزشوں سے پاک کرکے اپنے پیدا کرنے والے کی خالص مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے اور جس نصب العین

کی تکمیل کے لئے آدمی پیدا ہوا ہے اس کو حاصل کر سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں جس کا مطلب یہی تھا اور یہی ہے کہ قرآن پر ایمان لانے اور اسلام کے قبول کرنے کے بعد بھی سب کا خالق اور خدا بھی وہی رہے گا، جو پہلے تھا دین بھی سب کا وہی رہے گا۔ جو پہلے تھا یعنی جس قدرتی دستور العمل کی پابندی کا مطالعہ بندوں سے ان کے پیدا کرنے والے نے پہلے کیا تھا، اب بھی انسانیت کی نجات اسی قدرتی دستور العمل سے وابستہ ہوگی۔ الغرض خدا بھی وہی خدا رہے گا۔ جو ہمیشہ سے تھا اور دین بھی اصولاً وہی دین رہے گا جو ہمیشہ سے بنی آدم کا صحیح خدائی دین تھا بلکہ دین کے لانے والے یعنی پیدا کرنے والے کی مرضی سے آگاہ کرنے کے لئے بندوں میں وقتاً فوقتاً جو آتے رہے اور قوموں میں موروثی پیشواؤں کی حیثیت سے جو مانے گئے اور مانے جارہے ہیں ان کو اب بھی اسی طرح مانا جائے گا، جیسے پہلے مانا جاتا تھا گویا قرآن پر ایمان لانے کے بعد اس کا ہر ماننے والا پھر وہی ہو جاتا ہے جو پہلے تھا اور وہ سارے شکوک و شبہات جو مختلف تاریخی موثرات کے زیر اثر مذاہب اور مذاہب کے تعلیمات کے متعلق پیدا ہوگئے تھے۔ ان کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے نیز خدا کی باتوں کے ساتھ غیر خدائی چیزیں شعوری یا غیر شعوری طور پر انسانی زندگی کے قدرتی زندگی کے قدرتی دستور العمل میں باہر سے جو شریک ہوگئی تھی باہر کی ان آلودگیوں سے ہر ایک کا دین پاک بھی ہو جائے گا اور خاص حالات کے لحاظ سے دین میں جن آسانیوں کو انسانی فطرت تلاش کرتی ہے وہ بھی قرآن میں مل جائیں گی۔

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا — اللہ کی سرشت جس پر اللہ نے آدمی کو پیدا

لا تبدیل لخلق اللہ (القرآن) — کیا اللہ کی خلقت میں تبدیلی نہیں ہے۔

میرے نزدیک سورۂ روم کی اس آیت کا مفہوم بھی یہی ہے۔

کچھ بھی ہو قرآنی دعوت کا یہ دلآویز پیرایہ اور اس کے پکار کی یہ دلکشی تھی ہی ایسی کہ لوگ سنتے جاتے تھے اور مانتے جاتے تھے۔ عرب کے اندر تو ابتدا میں کچھ کش مکش کی شکلیں بھی پیش آئیں، ہچکچانے والے شروع شروع میں کچھ ہچکچاتے بھی رہے۔ زیادہ تر اس کش مکش اور ہچکچاہٹ میں جہاں تک میرا خیال ہے عربوں کی جاہلیت کو تھا۔

اسلام اور متمدن اقوام

لیکن جوں ہی کہ اسلام عرب کے جاہلوں سے نکل کر متمدن اقوام اور شائستہ امتوں کے درمیان پہنچا یہ واقعہ ہے کہ اس کے ماننے والوں نے اس کے ماننے اور تسلیم کر لینے میں اتنی عجلت سے کام لیا کہ آج اگر یہ پوچھا جائے کہ سارا شام سارا مصر سارا ایران ترکستان اور اسی قسم کے ممالک کے باشندے اچانک کیسے مسلمان ہوگئے تو غیر ہی نہیں میرا تو خیال ہے کہ خود مسلمان جو اپنی مستقل قومی تاریخ رکھتے ہیں۔ وہ بھی اس سوال کا شاید کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکے۔

پہلی صدی ہجری کے اندر اسلام قبول کرنیوالی قومیں

ہجری کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے

والوں میں بقول جرجی زیدان۔

معظم امم العالم المتمدن فی ذلك الحين وفيهم العرب والفرس والكلدان والروم والقوط والقبط والنوبة و البربر وكانوا يتكلمون العربية والفارسية والبهلوية والكردية والارمنية والقبطية و البربرية وغيرهما۔	اس زمانہ کے متمدن ممالک کا بڑا حصّہ شریک ہوگیا جس میں عرب بھی تھے اور ایرانی بھی، کلدانی بھی تھے اور رومی بھی گاتھ بھی تھے اور قبطی بھی، سودانی بھی تھے اور فارسی بولنے والے بھی، پہلوی زبان والے بھی اور کردی زبان والے بھی، قبطی زبان والے بھی، اور بربری بھی۔

(التمدن الاسلامی ص ۲۰۱ ج ۱)

باہر سے قوموں کو فتح کر کے سیاسی اقتدار کے شکنجوں میں ان کو کس لینا یہ نہ اسلام کا امتیاز ہے[1]۔ اور نہ کسی دین کی شایانِ شان یہ بات ہو سکتی ہے کہ مار مار کر لوگوں کو مال گذاری کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے اور سچ تو یہ ہے کہ جسمانی قوت یا اسلحہ کی برتری بھی ان لوگوں کو حاصل نہ تھی جن کے ہاتھوں پر ان قوموں نے اسلام کو قبول کیا، حیرت میں جو بات ڈال دیتی ہے وہ قوموں کا یہی اندرونی انقلاب ہے کہ جو قوم جتنی زیادہ

[1] آخر میں پوچھتا ہوں کہ فتوحات کی وسعت کے لحاظ سے ایرانی، یونانی، رومانی حکومتوں کے سوا اس زمانہ میں انگریزوں اور روسیوں نے جو کچھ کر کے دکھلایا ہے۔ کیا ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے فتح کئے ہوئے رقبوں کا کیا ہم ذکر بھی کر سکتے ہیں۔ اسلام کا اگر یہی کمال تھا تو اس کمال کی حق دار دنیا کی بہت سی قومیں ہیں۔ ۱۲

متمدن اور تعلیم یافتہ تھی اسی قدر اسلامی پیغام کے قبول کرنے میں اُس نے سبقت کی، اور کیوں نہ کرتی، شک کی جگہ یقین، مخلوط کی جگہ اپنے پیدا کرنے والے کی خالص مرضی اور خالص دین کو ڈھونڈھنے والے جب قرآن میں پا رہے تھے تو جو کچھ اُنہوں نے کیا اس کے سوا آخر وہ کیا کرتے البتہ ناواقفیت کی وجہ سے جن بے چاروں کو اس کا پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جس دین کو وہ مان رہے ہیں، اس میں صحیح عناصر کے ساتھ غیر دینی عناصر بھی گھُل مل گئے ہیں ان بیچاروں کو ضرور دشواری، پیش آتی تھی، لیکن جو جانتے تھے کہ دین اور دھرم کے نام سے جو چیز ان میں پائی جاتی ہے۔ یہ اُن کے آباؤ اجداد کے دین کی صحیح شکل نہیں ہے اس واقعہ کا جتنا واضح علم جن قوموں میں تھا اسی حد تک قرآن میں اپنے درد کی دوا ان کو نظر آئی، قرآن اُن کے لئے رحمت بن گیا گویا ان کے دل کی پکار کا وہ قدرتی جواب تھا اس کتاب پر ایمان لاتے کے ساتھ ہی اُن پر کھُل گیا کہ جو کچھ کھویا گیا تھا وہ بھی ان کو مل گیا اور حالات نے جن نئی ضرورتوں کو جو پیدا کر دیا تھا اُن کا حل بھی اس میں موجود تھا۔ قرآن کا یہی پوزیشن قوموں کے درمیان پہلے بھی تھا اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔ آسمانی کتابوں کا وہ آخری ایڈیشن ہے اس دعویٰ کا یہی منطقی نتیجہ اور اقتضا ہے۔ قدر و قیمت قرآنی دعوت کے اس پہلو کے مقابلہ ہی سے سمجھ میں آتی ہے کسی خاص نسل یا کسی خاص رنگ، یا خاص زبان یا خاص ملک کے باشندوں، یا خاص مذہب کے ماننے والوں کی حد تک اپنے خطاب کو قرآن اگر محدود

رکھتا اور بجائے جوڑنے کے اعلان کرتا کہ ہر قوم کو ان موروثی پیشواؤں اور آبائی ادیان سے توڑنے کے لئے وُہ نازل ہُوا ہے تو ماننے والوں نے جس طریقہ سے اس کتاب کو مانا کیا یہ کامیابی اس کے سامنے آسکتی تھی ؟

اسلام کے پیش کرنے میں اصولی غلطی

افسوس ہے کہ پیش کرنے والوں ہی کی طرف سے دوسروں کی ریس میں دیکھا جا رہا ہے، کچھ دنوں سے دیکھا جا رہا ہے کہ بجائے تصدیق و توثیق، تصحیح و تکمیل کے سابقہ مذاہب و ادیان اور ان کی تعلیمات ان کے پیشواؤں کی تحقیر و توہین کے اس طریقہ کو لوگ اختیار کر رہے ہیں۔ جو یورپ کے پادریوں کا طریقہ تھا۔

مذاہب کا تقابلی مطالعہ پادریوں کا دستور ہے

مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے عنوان سے یورپ کے ان ہی پادریوں نے مذاہب کی تحقیق و تفتیش کی یہ نئی راہ جو نکالی تھی افسوس ہے، کہ مسلمانوں میں بھی یہی طریقہ حسنِ قبول حاصل کر رہا ہے حالانکہ ضرورت ہے، کہ قرآن نے خود اپنے آپ کو قوموں کے درمیان جس طریقہ سے رکھا ہے اور ادیان و مذاہب کے سلسلہ میں اپنا طبعی مقام اس کتاب نے خود جو متعین کر دیا ہے اسی مقام پر اس کو رکھا جائے بلانے والوں کو چاہیئے کہ اسی مقام پر کھڑے ہو کر اس کتاب کی طرف لوگوں کو بلائیں اور اسی امتیازی رنگ کے

ساتھ قوموں میں اس کتاب کو روشناس کرائیں، یہ ہو سکتا ہے اور ہو بھی چکا ہے کہ سابقہ آبائی مذاہب سے قرآن چونکہ اپنے ماننے والوں کا رشتہ کلیۃً منقطع نہیں کرتا۔ اس لئے اسلام قبول کر لینے کے باوجود بعضوں میں اس زہر کا کچھ بچا کھچا اثر رہ جائے جن سے مذاہب و ادیان کو پاک کرنے کے لئے قرآن نازل ہُوا ہے میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآنی نقطۂ نظر کا تو نتیجہ یہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس نقطۂ نظر کے صحیح استعمال سے محرومی کا ثمرہ اُسے سمجھنا چاہیئے مگر کیا کیجئے ہر چیز کو ٹھیک اپنے صحیح صحیح مقام پر رکھ کر استعمال کرنے کا سلیقہ ہر ایک میں نہیں ہوتا۔

قرآن کے صحیح نقطہ نظر کے استعمال میں غلطی

مسلمانوں میں فرقہ بندی کی دو بنیادوں میں ایک بنیاد تو سیاسی اختلافات والی تھی، جس کا قصہ آپ سن چکے اور دوسری بڑی اہم بنیاد جس سے مسلمانوں میں مختلف فرقے اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں پیدا ہو گئے تھے اس کا تعلق جہاں تک میرا خیال ہے زیادہ تر اسی مسئلہ سے تھا، کہ غیر مذاہب کے لوگ شروع شروع اسلام میں داخل ہوئے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنے آبائی دین کے بعض زہریلے جراثیم کو اپنے اندر سے نکالنے میں جیسا کہ چاہیئے کامیاب نہ ہو سکے۔ بجائے تطہیر و تزکیہ کے ان لوگوں نے یہ چاہا کہ اپنے پُرانے خیالات کے مطابق قرآنی آیات کو کر لیا جائے ظاہر ہے کہ یہ بالکل قلب موضوع تھا قول فیصل تو قرآن تھا، لیکن

ان کو اندازہ ہُوا ہو یا نہ ہُوا ہو مگر کیا انہوں نے یہی کہ قرآن ہی کو تابع بنا لیا اور جن عقائد و خیالات کے ماحول میں موروثی طور پر ان کی پرورش ہوئی تھی ان ہی کو اصل کی حیثیت سے استعمال کرتے رہے یہ خطرہ پہلے بھی پیش آیا ہے اور قرآنی نقطۂ نظر کا غلط استعمال ممکن ہے کہ آئندہ بھی اس خطرے کو سامنے لائے۔

لیکن ظاہر ہے کہ غیر فطری کاروبار زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اسی غیر فطری کاروبار کے شکار ہو کر مسلمانوں میں نت نئے فرقے جن لوگوں کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ان کا انجام بتا رہا ہے، کہ خدا نخواستہ اگر یہ خطرہ پیش بھی آیا تو انشاء اللہ اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو پہلوں کا ہو چکا ہے اور اب مختصر الفاظ میں کچھ اسی اجمال کی تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

افسوس ہے کہ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کی داستان کا مطالعہ اس تاریخی نکتہ کی روشنی میں نہیں کیا گیا ہے ورنہ جتنے دردناک لہجوں میں اسلامی فرقوں اور ان کے انتشار پراگندگی کا مرثیہ سنایا جاتا ہے۔ شاید یہ کیفیت اس میں نہ پیدا ہوتی،

اختلاف کی ابتدا مسئلہ تقدیر سے ہُوئی

واقعہ یہ ہے کہ سیاسی اختلاف کے بعد مسلمانوں میں جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں اعتقادی اختلاف کی ابتدا مسئلہ قدر سے ہُوئی، صحیح مسلم میں ہے کہ:-

اول من قال فی القدر	سب سے پہلے قدر کے مسئلہ پر بصرہ میں معبد جہنی
بالبصرة معبد الجهنی ج۱ (بر فتح الملہم)	نے گفتگو کا آغاز کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی کافی تعداد زندہ تھی صحیح مسلم کی اسی روایت میں ہے کہ بصرہ سے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے اور قدر کے مسئلہ میں مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن عمر سے یہ کہتے ہُوئے کہ:-

ظهر قبلنا الناس یقرؤن	ہمارے سامنے کچھ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں جو قرآن
القرآن ویتفقرون العلم	بھی پڑھتے ہیں اور علم کی جستجو میں بھی رہتے ہیں، مگر
یزعمون ان لا قدر۔	خیال کرتے ہیں کہ قدر (تقدیر) کا مسئلہ صحیح نہیں ہے۔

جس سے معلوم ہُوا کہ قرآن پڑھنے اور جو علم قرآن تقسیم کر رہا تھا اس سے مستفید ہونے کے باوجود تقدیر کے یہ لوگ منکر تھے اتنی بات تو صحیح مسلم سے اجمالاً معلوم ہوئی، لیکن اس کی تفصیل کیا ہے؟ امام بخاری نے اپنے رسالہ "خلق افعال العباد" نامی میں قدریہ کے متعلق ایک روایت اپنی سند سے درج کی ہے جس میں ہے کہ:-

ایران کے مجوسیوں سے مسئلہ کا تعلق

ثمغلہ نامی ایک بد اعتقاد آدمی عباسی خلیفہ مہدی کے پاس لایا گیا، جس نے خلیفہ کے سامنے منجملہ دوسری باتوں کے بیان کیا تھا۔

القدری اذا غلا قال هما	قدری جب غلو سے کام لیتا ہے تو کہنے لگتا ہے کہ یہاں
اثنان خالق خیر وخالق شر	دو مستقل قوتیں ہیں ایک خیر کا خالق اور ایک شر کا خالق۔

اسی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ قدریہ یا معتزلہ جو یہ کہا کرتے تھے کہ آدمی کے بُرے بھلے کاموں کا خالق اور پیدا کرنے والا خدا نہیں بلکہ خود ان کاموں کا کرنے والا آدمی ہے تو یہ مسئلہ قدر کی ہلکی تعبیر تھی ورنہ درحقیقت تہ میں اس

کے وہی بات چھپی ہوئی تھی کہ خدا ہی شر کا بھی خالق ہے اور خیر کا بھی خالق ہے، دینِ زردشتی کا یہی دراصل صحیح عقیدہ تھا، لیکن فلسفیانہ موشگافیوں نے بجائے ایک کے خیر کے لئے الگ خالق اور شر کے لئے علیحدہ خالق کا عقیدہ ایرانیوں میں پیدا کر دیا مانا گیا کہ خیر اور بھلی چیزوں کے خالق کا یزدان اور شر یعنی بُری چیزوں کا خالق اہرمن ہے۔ ایرانیوں کا یہی غلط فلسفہ جو آخر میں ان کا دینی عقیدہ بن گیا تھا، سچ پوچھیے تو مسلمانوں میں پہنچکر اسی غلط عقیدے نے مسئلہ قدر کی شکل اختیار کر لی تھی یہ تو ہوئی مسئلہ کی حقیقت ر باقی مسلمانوں میں اس کو سب سے پہلے کس نے چھیڑا۔ صحیح مسلم کی مذکورہ بالا روایت میں اگرچہ بصرہ کے رہنے والے معبد جہنی کا نام لیا گیا ہے۔ لیکن امام بخاری نے اسی رسالہ خلق افعال العباد میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ:۔

المعتزلۃ فانھم ادّعوا ان فعل اللہ مخلوق وان افعال العباد غیر مخلوق۔

معتزلہ مدعی ہیں کہ اللہ کا فعل تو مخلوق ہے اور بندوں کے افعال مخلوق نہیں ہیں۔ یعنی خدا کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہیں۔

آگے خبر دی ہے کہ:۔

سنسویہ ایرانی نے مسلمانوں میں اس مسئلہ کو چھیڑا

وھذا اختلاف علم المسلمین الّا من تعلق من البصریین بکلام سنسویہ کان مجوسیا فادعی الاسلام ص۹۲

عام مسلمان جو کچھ جانتے ہیں اس کے یہ مخالف ہے۔ البتہ بصرہ میں جن لوگوں نے سنسویہ کی بات مانی، یہ سنسویہ پہلے پارسی تھا، بعد کو اسلام کا مدعی ہوا۔

مقریزی نے بھی خطط میں لکھا ہے کہ:۔

اخذ معبد ھذا الرای من رجل من الاساورۃ یقال لہ ابو یونس سنسویہ ویعرف بالاسواری (ص۱۸۱ ج۴)

معبد جہنی نے دراصل اس عقیدہ کو سنسویہ سے اخذ کیا تھا، جو اساورہ میں تھا سنسویہ کی کنیت ابو یونس تھی اور الاسواری کی نسبت سے منسوب تھا۔

سنسویہ یزدگرد کے باڈی گارڈ کا افسر تھا

الاسواری کا مطلب البلاذری میں دیکھئے لکھا ہے کہ ایران کے آخری بادشاہ یزدگرد کے خاص باڈی گارڈ کے یہ سوار تھے سیاہ الاسواری ان کا کمانڈر تھا۔ اصطخر[1] کی حفاظت کے لئے یزدگرد نے اس کو بھیجا اور وہاں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری کے مقابلہ میں سوس پہنچا جہاں شکست فاش کھانے کے بعد صلح کی درخواست کی اور مسلمان ہو کر بصرہ میں معاہدہ کر کے الاسواری مقیم ہو گئے یہ سنسویہ ان ہی الاسواریوں کا ایک آدمی تھا اور مسلمان ہونے کے بعد مجوسی عقیدہ کے زیر اثر مسلمانوں میں قدر کے مسئلہ کو پھیلا کر پہلی دفعہ ایک اعتقادی فرقہ کی بنیاد اسی کے ہاتھوں قائم ہو گئی امام بخاری ہی نے خواجہ حسن بصری کا قول معتزلہ کے متعلق نقل کیا ہے۔

[1] پرسی پولس یا تخت جمشید بھی اصطخر کو کہتے تھے ایرانیوں کا سب سے بڑا مقدس شہر تھا ابن حزم نے لکھا ہے کہ خدائے نامہ جو ایرانیوں کی آسمانی کتاب کا نام تھا مدت تک اس کتاب کے پڑھنے پڑھانے کا حق صرف اصطخر کے موبدوں کو تھا گویا ایران کا وہ بنارس تھا ص۱۳ ج۱۔

معتزلہ کو ایرانیوں نے ہلاک کیا

خواجہ حسن بصری کا قول

اھلکتھم العجمۃ (اقوال العباد ص۹۲) — معتزلہ کو ایرانیت نے ہلاک کر دیا۔

دیکھا آپ نے کھودنے کے بعد معتزلہ کی بنیاد کہاں ملی؟۔

اور کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی چند ابتدائی صدیوں میں کافی زور اس فرقہ کا رہا خصوصاً بعض عباسی حکمرانوں کی پشت پناہی میں بہت کچھ کھیل کھیلنے کا بھی موقعہ ان کو ملا لیکن وہ جو کچھ بھی ہوں قرآن کو مخلوق مانتے ہوں یا غیر مخلوق اتنی بات تو بہر حال ان کے اندر بھی جاگزیں تھی کہ یہ خدا کا کلام ہے اور "قول فیصل" ہونے کا قدرتی استحقاق قرآن ہی کو حاصل ہے ابتدا میں ان کو نہ محسوس ہوا ہو، کہ کس کو تابع اور کس کو متبوع بنا رہے ہیں لیکن جیسے جیسے ایک نسل کے بعد دوسری نسلیں ان کی گذرتی رہیں وہ نتھرتے جاتے تھے تا اینکہ ایرانیت کا موروثی دباؤ گھٹتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اب ڈھونڈنے سے بھی معتزلہ کا پتہ مسلمانوں میں نہیں چلتا۔ ہمارے مورخین نے لکھا ہے کہ:۔

علم کلام کی باگ

معتزلہ کے ہاتھوں میں دو سو سال رہی

کان علم الکلام بایدی المعتزلۃ مائتی سنۃ ما بین المائۃ و الثلاث مائۃ

علم کلام کی باگ معتزلہ کے ہاتھوں میں دو سو سال تک رہی یعنی پہلی صدی کے بعد تیسری صدی کے اختتام تک۔

اس کے بعد تو معتزلہ کا جو حال ہوا، وہ اسی سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے کتب خانوں میں ڈھونڈنے والے برسوں سے ڈھونڈھ رہے ہیں کہ اس فرقہ کی کوئی کتاب کلام یا اصول فقہ وغیرہ جیسے علوم کے متعلق مل جاتی لیکن کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ کتاب تو کتاب شاید چند اوراق بھی نہیں مل سکتے اہل السنت والجماعت کی کتابوں میں معتزلہ کے آراء و نظریات کا تردیداً جو ذکر کیا گیا ہے کچھ تو ان سے ان کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اور بعض کتابیں تفسیر یا لغت و ادب میں ان کی جو ملتی ہیں ان سے ان کے اعتقادی رجحانات کی سراغ رسانی میں تھوڑی بہت مدد ملتی ہے۔

کچھ بھی ہو میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ایسے اختلافات جنہیں صحیح معنوں میں ہم اصولی اختلافات کہہ سکتے ہیں زیادہ تر ان کی پیدائش میں سیاسی اختلافات کو ہم دخیل پاتے ہیں، یا پھر باہر سے مسلمانوں کے اندر چیزیں مختلف راہوں سے داخل ہوتی رہیں۔ خیالات پر وہ بھی اثر انداز ہوئیں ابتداء اسلام میں مختلف دینی قوموں کے افراد مسلمان ہو کر اسلامی دائرہ میں داخل ہو رہے تھے اپنے ساتھ اپنے آبائی عواطف موروثی رجحانات کو بھی وہ لائے بجائے تصحیح* کام لیتے۔ بعضوں نے تطبیق کا ارادہ کیا چاہا کہ خاندانی روایات واحساسات میں تھوڑی بہت ترمیم کر کے ان کو قرآنی نصوص کے مطابق بنا لیں یا قرآنی تعلیمات کو کھینچ تان کر اپنے آبائی خیالات پر منطبق کر کے دونوں ہی سے اپنا تعلق باقی رکھیں مگر نے

* کے یعنی دین کی قدرتی کتاب کا آخری ایڈیشن قرار دے کر تصحیح کا

دا سے جان بوجھ کر ایسا کرتے تھے اس بدگمانی سے بچتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ غیر شعوری طور پر اپنے آبائی مالوفات سے قطعی بے گانگی ان کے لئے آسان بھی نہ تھی۔ بہر حال دانستہ ہو یا نادانستہ مگر ہوا یہی کہ تاویل وتعبیر یا کھینچ تان کی اس نکوہیدہ و ناپسندیدہ کوشش نے مسلمانوں میں ایسے خیالات پیدا کر دیئے جنہیں صحیح معنوں میں نہ تو اسلامی تعلیمات ہی کا صحیح نتیجہ قرار دیا جا سکتا تھا اور سچ پوچھئے تو ان کے موروثی عقائد بھی اپنے اصلی رنگ کو کھو کر نئے قالب میں جلوہ گر ہوئے۔ یہی قدر کا مسئلہ ہے۔ تاریخی شواہد کی روشنی میں آپ پڑھ چکے کہ قدریہ کا یہ نظریہ جو آج کل ہماری کتابوں میں مسلمانوں کے فرقہ معتزلہ کی طرف منسوب ہے یعنی اپنے اختیاری اعمال وافعال کے خالق خود بندے ہیں، خدا کی تخلیقی کارفرمائیوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدر کے اس عقیدے کی بنیاد تو ڈالی مسلمانوں میں ایک پارسی نومسلم سنسویہ نامی نے جو ایرانی فوج کے اسواریوں سے تعلق رکھتا تھا بات وہی تھی کہ کائنات میں شر یا برائی کا پہلو جن چیزوں میں پایا جاتا ہے ایرانی ذہنیت قرنہا قرن سے عادی تھی کہ ان کی آفرینش اور خلق سے حق تعالیٰ کی ذات کو پاک قرار دے۔ ساری برائیوں کی پیدائش کا الزام اہرمن کے سر تھوپ دیا جاتا تھا۔ اس باب میں ایران باشندوں کی حسی نزاکت اس درجہ تک ترقی کر کے پہنچ چکی تھی کہ "اہرمن" کے لفظ لکھنے کی ضرورت ہوتی تو بیان کیا جاتا ہے کہ الٹ کر "نمرہا"

کی شکل میں اسے لکھتے تھے[1] مقصود اور مطلب یہی تھا کہ خدا جسے وہ اہرمزد کہتے تھے اس کے دامن کو شرور اور برائیوں کے انتساب سے پاک رکھا جائے گویا ان کے نزدیک خدا کی تقدیس وتسبیح کی شکل ہی یہ تھی کہ شرور اور برائیوں کو اس کے دائرہ تخلیق سے خارج کر دیا جائے[2]

---

[1] دیکھو اے مینول آف بائیبل ہسٹری بلیکی ص۲۰۳ ترجمہ اردو، اس مرتعہ پر بے ساختہ اپنے ایک مرحوم استاذ غفر اللہ لہ کا خیال آرہا ہے، مولانا نصیر احمد ان کا نام تھا وطن پھلت تھا ٹونک میں مدرسہ خلیلیہ کے صدر مدرس تھے، منطق واصول فقہ وغیرہ کی بعض ابتدائی کتابیں خاکسار نے ان سے پڑھی تھیں، ان کا دستور تھا کہ پوسٹ کارڈ یا لفافے پر پتہ بجائے سیدھے طریقے کے الٹ کر لکھتے کارڈ لفافے کی تصویر نیچے پڑ جاتی، دریافت پر بولے کہ انگریزوں کی توہین وتحقیر کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اس کے بادشاہ کی منڈی کی تصویر اوندھی کر دی جائے ۱۲۔

[2] یہاں تفصیل کا تو موقع نہیں ہے لیکن خیر وشر کے الفاظ تو بیشک جدا جدا ہیں مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ الفاظ سے ہٹ کر دیکھنا چاہیئے کہ واقعہ کی نوعیت کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی چیز ہوتی ہے جو استعمال سے کبھی خیر کبھی شر بن جاتی ہے آگ ہی کو لیجئے کھانا پکانے روشنی حاصل کرنے کا کام اس سے لیا جائے تو بہترین شے ہے لیکن اسی آگ سے گھر جلا دئے جائیں کھیتیاں جھلسا دی جائیں تو شر بن جاتی ہے ایسی صورت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ ایران کے اربابِ دانش نے ایک ہی مخلوق کے لئے دو خالق کے نظریہ کو بنایا کیسے استعمال کی صحت سے ہر بری شے بھلی بن جاتی ہے اور استعمالی غلطی سے بھلی چیز بھی بری بن جاتی ہے گویا اس لحاظ سے مشکل ہی سے ایسی کوئی چیز رہ جاتی ہے جو خدا کی مخلوق بننے کی مستحق ہو، تفصیل کے لئے میری کتاب الدین القیم کا مطالعہ کیا جائے ۱۲۔

ظاہر ہے کہ خلقِ شر کے متعلق جن کی ذہنی نزاکتوں کا یہ حال ہو قبول اسلام کے بعد اگر بندوں، کے برے اعمال وافعال کا خالق بجائے خدا کے بندوں ہی کو وہ ٹھہرانے لگے اور برے اعمال وافعال کے بعد لازمی طور پر نیک اعمال کے خلق وآفرینش کو بھی بندوں ہی کی طرف منسوب کرنا ناگزیر تھا، یہی خلق افعال کا مسئلہ ہے جس کی اصطلاحی تعبیر قدر کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ اختیاری اعمال وافعال کی جزاو سزا کے قانون کی تصحیح کے لئے ناگزیر ہے کہ بندوں کو بھی ان کے افعال کی پیدائش میں اس حد تک دخیل مانا جائے کہ فعل کی ذمہ داری کرنے والوں کے سر عاید ہو سکے۔

لیکن اسی کے ساتھ خالق قیوم کا اپنے کن فیکونی مخلوقات[1] سے جو

[1] کن فیکونی مخلوقات کی اصطلاح کو سمجھنے کے لئے چاہیئے کہ ہم میں ہر شخص خود اپنے اندر غور کرے اپنے معلومات کو خیالی قوت سے ہم جو پیدا کرتے ہیں سوچے کہ اس وقت کیا ہوتا ہے دلی کی جامع مسجد کو آپ جانتے ہیں پلنگ پر لیٹے لیٹے خیالی قوت سے اپنے اسی معلوم یعنی جامع مسجد کو اپنے سامنے آپ کھڑی کر لیتے ہیں یہ آپ کی تخلیقی کارفرمائی ہے غور کیجئے کہ یہ خیالی جامع مسجد جو آپ کے ذہن کے سامنے کھڑی ہے صرف پیدا ہونے ہی میں آپ کے ارادے کی محتاج نہیں ہے بلکہ باقی رہنا اس کا یہ بھی آپ کی توجہ کے ساتھ وابستہ ہے اس کو کن فیکونی مخلوق کہتے ہیں کہ ارادے کے ساتھ آپ کا معلوم آپ کی مخلوق بن جاتا ہے اسی طرح زید جسے آپ جانتے ہیں اور آپ کا معلوم ہے خیالی قوت سے اسی معلوم کو اپنی مخلوق بنا کر دیکھئے وہ اپنی پیدائش میں بھی بقا میں بھی آپ کے تخلیقی ارادے کا محتاج نظر آئے گی آپ اٹھائیں گے تو اٹھے گا بٹھائیں گے تو بیٹھے گا رلائیں گے تو روئے گا ہنسائیں گے تو ہنسے گا یہی مطلب ہے کہ کن فیکونی مخلوق ذاتاً

بقیہ اگلے صفحہ پر دیکھئے

تعلق ہوتا ہے، اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقل اس کو بھی تو سوچ نہیں سکتی کہ بندے جو خدا کی کن فیکونی مخلوقات ہیں، اپنے اعمال وافعال کی تخلیق و آفرینش میں کلیتہً استقلالی اقتدار کے مالک ہیں بلکہ نصوص کا اقتضا بھی یہی ہے اور عقل بھی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد اسی فیصلہ پر مجبور ہے کہ اپنے وجود میں صفات میں، بندے جیسے ہر لمحہ خالق تعالیٰ کی تخلیقی کارفرمائیوں کے دست نگر ہیں اسی طرح اعمال وافعال جو بندوں سے صادر ہوتے ہیں ان کی تخلیق وآفرینش کا تعلق بھی براہ راست خالقِ کائنات ہی کے مسلسل تخلیقی فیض اور ارادے کے ساتھ وابستہ تسلیم کیا جائے۔

الغرض بندوں کے اختیاری اعمال وافعال کی تخلیق میں خدا کے ساتھ کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی حیثیت سے بندوں کو بھی دخل ہے واقعہ کی اصل حقیقت یہی ہے اور اسلامی وثائق میں نصوص جو پائے جاتے ہیں ان میں واقعہ کے دونوں پہلوؤں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ مسئلہ کو اسی اجمالی رنگ میں لوگ مانتے چلے آرہے تھے۔ لیکن یہی سنسویہ ایرانی پہلا آدمی تھا جس نے مسلمانوں میں بجائے اجمال کے چاہا کہ بندوں کے اعمال وافعال کے تخلیقی عمل سے خدائی ارادے کو قطعاً بے تعلق ٹھہرا دیا جائے اسی کے مقابلہ میں ایک دوسرا فرقہ اٹھ کھڑا ہوا جو جبر محض کے خیال کو مسلمانوں میں پھیلانے لگا حاصل جس کا وہی ہے کہ بندہ مجبور محض ہے نیک و بد اعمال جو بھی بندوں سے صادر ہوتے ہیں انکو براہ راست خدا پیدا کرتا ہے بندے کے ارادہ اور اختیار کو ان میں کسی قسم کا کوئی دخل نہیں ہے

وجوداً صفاتاً و فعلاً اپنے خالق کے تخلیقی فیض کا ہر آن اور ہر لمحہ محتاج ہوتی ہے میری کتاب الدین القیم، میں مسئلہ کی تفصیل پڑھیئے۔

فرقہ جبریہ کا بانی جہم بن صفوان

کہتے ہیں کہ تابعین (یعنی صحابہ کے تعلیم یافتہ طبقہ) ہی کے زمانہ میں جبر کے اس نظریہ سے مسلمانوں کو سب سے پہلے ایک شخص جہم نامی نے آشنا کیا تھا۔ اسی کی طرف منسوب ہو کر جہمیہ نامی فرقہ پیدا ہوا۔ اسلام کی ابتدائی صدیوں کو جہم اور جہمیہ کے چرچوں سے ہم معمور پاتے ہیں

مگر جہم کون تھا کن لوگوں سے متاثر ہوا جبر کے سوا اور بھی کس کس قسم کے اعتقادی اختلافات کی مسلمانوں میں اس کی وجہ سے بنیاد پڑی یہی سننے کی بات ہے۔

جہم ہندوستان کے فلاسفہ سے متاثر ہوا

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی تاجروں کا جو قافلہ بلخ ہوتا ہوا سمرقند جایا کرتا تھا، اس کو راستہ میں مشہور خراسانی شہر ترمذ کے قریب نویدہ نامی مقام پہ دریائے زامل کو عبور کرنا پڑتا تھا جو جیحوں کا معاون دریا ہے یہ نویدہ ہمارے یہاں کی تاریخوں میں قرب مکانی کی وجہ سے معبر ترمذ کے نام سے موسوم تھا یعنی ترمذ کی گزر یا گھاٹ اس کو کہتے تھے اسی معبر ترمذ پر محصول وصول کرنے والوں کی ایک چوکی بنی تھی، بنی امیہ کا زمانہ تھا۔ ہشام[1] بن عبدالملک کی حکومت کے ایام میں معبر ترمذ (نویدہ)

[1] ہشام بن عبدالملک پہلی صدی ہجری کے اختتام اور دوسری کی ابتدا یعنی ۱۰۵ھ میں

بقیہ حاشیہ آئندہ

کی چوکی کا داروغہ جہم بن صفوان نامی ایک آدمی تھا حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں لکھا ہے کہ

کان جہم من موالی بنی راسب (ص ۱۴۲ ج ۲) — بنی راسب عربی قبیلہ کے غلاموں کے خاندان سے اس کا تعلق تھا۔

اب خواہ غلاموں کے جس خاندان سے بھی جہم کا تعلق تھا وہ آزاد ہو گیا یا آزاد نہ ہوا ہو، بہرحال تھا اس کا نسلی تعلق موالی ہی سے۔ اسی لئے صحیح طور پہ یہ کہنا دشوار ہے کہ وہ عربی نژاد تھا بھی یا نہیں کچھ بھی ہو لکھنے والوں نے اسی کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ ابتدائی زندگی جہم کی کوفہ میں گزری تھی، فصیح عربی زبان بولتا تھا۔ فتح الباری میں حافظ نے نقل کیا ہے کہ:۔

کان جہم من اہل الکوفۃ و کان فصیحا ص۲۹۵ ج ۱۲ — جہم کوفہ کا رہنے والا تھا اور فصیح زبان بولتا تھا۔

لیکن اسی کے ساتھ ایک سے زیادہ مورخوں کا بیان یہ بھی ہے کہ

لم یکن لہ علم ولا مجالسۃ اہل العلم۔ فتح الباری ص۲۹۵ ج ۱۲۔ — نہ خود علم والا تھا اور نہ اہل علم کی صحبت ہی اسے میسر آئی تھی۔

گدی نشین ہوا۔ امام احمد بن حنبل کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ ہشام بن عبدالملک کے زمانہ کے دواوین (سرکاری کاغذات) میں جہم کا ذکر میں نے پایا (فتح الباری ص۲۶۹ ج ۱۲) اسی سے سمجھا جاتا ہے کہ ہشام کے عہد حکومت میں جہم سرکاری ملازم تھا کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی ملازمت کا سلسلہ کب سے شروع ہوا تھا بہرحال پہلی صدی ہجری میں اس کا وجود یقینی ہے ۱۲۔

اسی لئے چنگی کی چوکی کی معمولی ملازمت ہی اس کو مل سکی تھی، حافظ ذہبی نے لکھا ہے۔

كان على معبر ترمذ — ترمذ کی گزر پر اس کا تقرر ہوا تھا۔

جہم کے یہ تو مختصر ذاتی حالات تھے۔

اب سنئے ذہبی نے اپنی کتاب العلو میں یہ روایت نقل کی ہے کہ جس زمانہ میں جہم ترمذ کی گزر والی چوکی میں مقیم تھا۔

فكلم السمنية فقالوا صف لنا	جہم کی سمینہ فرقوں سے بات چیت ہوئی
ربك الذي تعبد منه ۱۳	سمینہ فرقہ والوں نے پوچھا کہ جس خدا کو تو
كتاب العلو ضميمہ غاية المقصود	پوجتا ہے اس کے صفات بیان کر۔

آپ نے سمجھا سمینہ کے اس لفظ سے کیا مراد ہے؟ جاننے والے جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہبی فرقہ کی تعبیر مسلمانوں کے علم کلام کی کتابوں میں سمینہ کے لفظ سے کی جاتی ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سومنات کی طرف منسوب کر کے مسلمانوں نے ان لوگوں کو سمینہ کہنا شروع کیا تھا[1] واللہ اعلم بالصواب۔

عرض کر چکا ہوں کہ بلخ کے مسافر سمرقند جانے کے لئے ترمذ کے اس معبر نوبیدہ سے گزرتے تھے اور بلخ ہی وہ مقام تھا جو باب الہند سمجھا جاتا تھا، ہندوستان کے تجار خراسان جانے کے لئے پہلے بلخ ہی پہنچتے

[1] یا عکس ہے کہ بدھ مذہب کے یہ علماء ہوں، ابوریحان بیرونی نے الآثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ خراسان والے بدھ مت کے ماننے والوں کو "شمنان" کہتے تھے ۱۲۔

تھے بلخ میں باب الہند کے نام سے اسی لئے ایک مستقل دروازہ تھا[1]

بہر حال کہنا یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجروں ہی کی طرف سے جہم بن صفوان کے دل میں پہلی دفعہ یہ سوال ڈالا گیا۔ اس وقت تک مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ قرآن پڑھتے تھے۔ اس میں خدا کے متعلق یہ بھی تھا کہ الرحمان عرش پر مستوی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی اسی قرآن ہی میں موجود ہے کہ وہی ہر شے کو محیط ہے، وہی ہر ایک کے ساتھ ہے وہ حبل الورید (گردن کی شہ رگ) سے بھی زیادہ قریب ہے، وہی اول ہے، وہی آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے۔ وہی باطن ہے۔ وہی آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے[2] الغرض مسلمان عرش والی آیت کو بھی پڑھتے تھے۔ اور دوسری آیتیں بھی برابر ان کی تلاوت میں گذرتی رہتی تھیں ان کے ایمان میں دونوں ہی کی گنجائش تھی حقیقت بھی ان ہی اجمالی تعبیروں میں پوشیدہ تھی کچھ یہ بھی کچھ وہ بھی، ٹھیک جیسے خلق افعال کے قصے میں کچھ یہ بھی صحیح کچھ وہ بھی صحیح یہی واقعیت کی صحیح ترجمانی ہے۔

[1] جغرافیائی معلومات کے لئے جی۔ لی۔ اسٹرینج کی کتاب "جغرافیہ خلافت مشرقی" کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جس کا ترجمہ اردو دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ ۱۲۔

[2] خلیفۃ اللہ یعنی انسان خود اپنے اندر دیکھتا ہے کہ اس کی روح بدن کے کسی حصہ سے غائب نہیں ہوتی ہر ایک پر شاہد و حاضر ہے تاہم قلب کے ساتھ روح کا خاص استوائی تعلق ہی ایسا تعلق کہ سارے بدنی نظام کا کاروبار اسی سے چل رہا ہے قلب سے روح کا استوائی تعلق جس وقت ختم ہو جاتا ہے بدن کے سارے اجزا منتشر اور پراگندہ ہو جاتے ہیں۔

لیکن جہم جو نہ خود علم سے بہرہ رکھتا تھا اور نہ علماء کی صحبتوں سے مستفید ہونے کا موقع اس کو ملا تھا اچانک "ہندی فلسفہ" کی لاحاصل موشگافیوں سے اس کا دماغ دوچار ہوا، لکھا ہے کہ سوال کے بعد

فدخل البیت لا یخرج مدۃ — جہم کوٹھری میں گھس گیا اور زمانہ تک باہر نہ نکلا

(فتح الباری ص ۲۹۵ ج ۱۲)

یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ چالیس دن تک مبہوت رہا جن میں نماز بھی اس نے نہ پڑھی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سمینہ (ہندی تاجروں) نے صرف سوال ہی کرکے چھوڑ نہیں دیا تھا بلکہ سوال وجواب کا سلسلہ بھی دونوں طرف سے جاری رہا۔

امام بخاری نے اپنی کتاب "افعال العباد" میں جو روایت اسی سلسلہ میں درج کی ہے۔ اس کے ان الفاظ سے یعنی۔

فخاصمہ بعض السمینۃ فشك فاقام اربعین یوما لا یصلی ص ۶۹ — جہم سے سمینہ فرقہ کے بعض لوگوں نے مباحثہ کیا، پس جہم شک میں مبتلا ہوگیا اور چالیس دن ایسے گزارے جن میں نماز نہ پڑھی۔

ان سے تو صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ جہم اور سمینہ میں کافی گفتگو ہوئی اس کے بعد دیکھا گیا کہ لوگوں کے سامنے اپنے عقیدے کا اظہار حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے متعلق یہی جہم ان الفاظ میں کررہا ہے کہ

ھو ھذا الھواء مع کل شیء وفی کل شیء ولا یخلو منہ شیء — وہ (خدا)، یہی ہوا ہے ہر چیز کے ساتھ ہر چیز میں اور اس سے (خدا) سے کوئی چیز خالی نہیں،

ص ۲۹۵ ج ۱۲ فتح الباری

غلط وحدت الوجود کا تخم اوّل

اور یہی تھا اس غلط وحدت الوجود کا تخم اول جسے مسلمان صوفیوں کے بعض طبقات میں غیر معمولی ہردل عزیزی حاصل ہوئی۔ مسئلہ کی ابتدائی تعبیر ایک سادہ دل، غیر علمی آدمی کی یہی ہوسکتی تھی، عرش پر الرحمن کا استواء جو قرآن کا منصوص مسئلہ تھا۔ اس کا مضحکہ اڑایا گیا اور اجمال جو مسئلہ کی روح تھی جہم نے چاہا کہ مسلمانوں کو اس سے ہٹادے اس کے مقابلہ میں ایک طبقہ پیدا ہوا جو عرش والی نص کو اصل قرار دے کر قرآن ہی کے دوسرے بینات جن میں احاطہ معیت، قرب اقربیت اولیت وآخریت ظاہریت وباطنیت کا صراحۃً ذکر کیا گیا ہے ان سب کی اللہ کے بندوں نے تاویل کی۔ ابہام واجمال کی قدر وقیمت گم ہوگئی دو مستقل فرقے عرشیوں اور فرشیوں کے پیدا ہوگئے۔

ان عرشیوں اور فرشیوں کا قصہ اتنا دراز ہے جس کے لئے اس مختصر سے مضمون میں بھلا کیا گنجائش پیدا ہوسکتی ہے[1]

[1] امام بخاری نے اپنی کتاب خلق افعال العباد میں ایک روایت درج کی ہے جس میں راوی نے بیان کیا ہے کہ قرآن کی سورۂ طٰہٰ کی آیت الرحمن علی العرش استوی کا ذکر کہتے ہوئے جہم ایک دن بولا کہ کاش میرے بس کی بات ہوتی تو اس آیت کو قرآن سے چھیل کر نکال دیتا صدا فرشیوں کی اس مجرمانہ آرزو کے مقابلہ میں منہ سے تو کہتے ہوئے نہیں سنا

میں تو اس وقت صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ سیاسی خرخشوں کے بعد جتنے اصولی اختلافات بھی مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ اگر سراغ لگایا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا رشتہ براہ راست اسلام سے نہیں بلکہ اسلامی دائرے کے بیرونی فتنوں سے ہے یہی جہم تھا، جس نے خدا کو ہوا ٹھہراتے ہوئے ہر چیز میں ہر چیز کے ساتھ بتاتے ہوئے دعویٰ کیا کہ کوئی چیز اس سے خالی نہیں یا ایں ہمہ وہ اس تنزیہی عقیدے کا بھی داعی تھا کہ۔

لا اصفہ بوصف یجوز اطلاقہ علی غیرہ۔	ہر ایسی صفت جس کا انتساب غیر خدا کی طرف ہوتا ہو، ہم خدا کی طرف اس صفت کو منسوب نہیں کر سکتے۔

(ص ۲۹۴ فتح الباری ج ۱۲)

اسی لئے خدا کو حی (زندہ) عالم (دانا) مرید (ارادہ کرنے والا) کہنا یا وہ سنتا ہے، دیکھتا ہے، ان باتوں کے انتساب کو وہ ناجائز قرار دیتا تھا مشہور ہے کہ امام ابو حنیفہ نے جہم کی تنزیہی تعلیم کو سن کر کہا تھا کہ مآل اس کا یہی ہے کہ خدا گویا کچھ نہیں ہے، معدوم ہے واقعہ یہاں بھی وہی تھا کہ لیس کمثلہ شیٔ کی بنیاد پر خدائی صفات کو مخلوقات کے صفات پر

له ہے لیکن عرشیوں کے دل میں بھی قرب احاطہ معیت اقربیت اولیت آخرت ظاہریت باطنیت والی آیتوں کے متعلق کچھ اسی قسم کے تمنائی بیچارے اضطراراً اگر الجھتے ہوں تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے آخر عرش کے استواء والی ایک آیت کو اصل قرار دے کر قرآن کی بیسیوں آیتوں کے ساتھ تاویل بلکہ شاید تحریف تک کی جرأت کیا معمولی جرأت ہے ۱۲۔

قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا لیکن قرآن میں خدا کی طرف جن صفات کا انتساب کیا گیا ہے ان کا کلیۃً انکار کیسے کیا جا سکتا ہے پھر اس کے اس تنزیہی ادعا نے کلام کے مسئلہ کو پیدا کیا کہتا تھا کہ کلام تو مخلوق کی صفت ہے خدا اس سے کیسے موصوف ہو سکتا ہے۔

بہر حال جہم پہلا آدمی تھا جس نے خدا کی صفت کلام کا انکار کر کے قرآن کو بجائے کلام اللہ کے مخلوق اللہ کہنے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق ہے اس مسئلہ کے تاریخی تفصیلات سے لوگ عموماً واقف ہیں، ابتدائی بنیاد اس کی جہم ہی نے رکھی تھی[له]۔

ارباب صدق و صفا، اخلاص و وفا کو اس راہ میں جن شدائد و مصائب سے گزرنا پڑا، خصوصاً سراج الامت سیدنا حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے جس بے جگری اور پامردی کے ساتھ اس فتنہ کا مقابلہ کیا اسلامی تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف میں یہ داستان آج تک لکھی ہوئی ہے۔

مسئلہ انا الحق کی بنیاد

اسی طرح انسانی وجود کا شعوری نقطہ یا ذات کا احساس عربی

له اس موقعہ پر یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ٹھیک ان ہی دنوں میں ہمارے وطن ہندوستان میں یہ مسئلہ مذہبی دائرے میں چھڑا ہوا تھا کہ وید کے "شبد" یعنی کلام قدیم ہے یا حادث میمانسا والے قدیم مانتے تھے۔ نیائے والے حادث۔ دیکھو قرون وسطیٰ میں ہندوستان۔

ہیں جیسے "انا" فارسی میں "من" اور ہم ہندوستان والے "میں" کے لفظ کا اطلاق جس پر کرتے ہیں ظاہر ہے کہ جیسے دنیا کی ہر چیز "شئی" ہے "شئی" کے نیچے ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ بھی داخل ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات کہ کسی شے سے خدا غائب نہیں ہے بلکہ قرآنی الفاظ میں۔

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ — اور اللہ ہر چیز پہ شاہد (حاضر) ہے

کا کھلا ہوا اقتضاء یہی ہے کہ جب ہمارے وجود کا یہ شعوری نقطہ "انا" بھی شے ہے تو حق تعالیٰ کا "انا" کے لئے شہید و حاضر ہونا، قرآن ہی کی سکھائی ہوئی بات ہے، یہی منوایا گیا تھا اسی کو مسلمان مانتے چلے آتے تھے ایک جاہل ان پڑھ مسلمان بھی اپنے آپ کو مثلاً کسی مصیبت میں جب مبتلا پاتا ہے تو دل ہی دل میں وہ اسی "عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْد" ہستی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر سوال و جواب کا سلسلہ بھی شروع کر دیتا ہے یہ روزمرہ کے تجربہ کی بات ہے، ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کے شعور کو اپنے "انا" میں اگر وہ نہیں پاتا تو اضطراراً یہ حرکت اس سے کبھی سرزد نہ ہوتی بلکہ شاید اس احساس و شعور کے لئے تو مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں بظاہر آدمی کا یہ فطری احساس معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال نظر کے سامنے نور ہو اور نور کا شعور نظر کو نہ ہو۔ شنوائی کی قوت تک آواز پہنچ جائے اور آواز کو شنوائی کی قوت محسوس نہ کرے جیسے یہ نہیں ہو سکتا اسی طرح انسانی وجود کا وہ حصہ جو مطلق شعوراً اور

شعور ہی شعور ہے۔ جب حق تعالیٰ اس سے غائب نہیں ہیں بلکہ اس شعوری نقطہ پر بھی وہ شاہد اور حاضر ہیں تو "انا" کے لئے ذاتِ حق کا شعور ظاہر ہے کہ ایک بدیہی بات ہے لیکن اس سے نہ آدمی کا "انا" "حق" بن جاتا ہے اور نہ کسی طرح یہ سمجھنا درست ہو سکتا ہے کہ

انا الحق والے حسین بن منصور کا ہندوستان سے رشتہ

حق انا ہے کیا بینائی نور ہے یا شنوائی کی قوت آواز ہے، بات بالکل واضح اور کھلی ہوئی تھی لیکن جانتے ہیں سب سے پہلے "انا الحق" کا نعرہ مسلمانوں میں جس نے لگایا یعنی حسین بن منصور جو عوام میں منصور ہی کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں جانتے ہیں کہ اس منصوری دعوی کے مدعی حسین بن منصور کون تھے؟۔

الخطیب اپنی تاریخ بغداد میں اطلاع دیتے ہیں کہ۔

کان جدہ مجوسیا اسمہ محمی من اھل بیضاء فارس ص۱۱۲ ج ۸۔ — حسین بن منصور کا دادا مجوسی تھا نام اس کا محمی تھا ایران کے شہر "بیضا" کا رہنے والا تھا۔

اور صرف یہی نہیں خطیب نے حسین بن منصور کے صاحبزادے احمد نامی کے حوالہ سے ایک طویل روایت نقل کی ہے جس میں یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ ان کے والد حسین بن منصور نے۔

قصد الی الھند ص۱۱۳ — ہندوستان کا ارادہ کیا۔

لکھا ہے کہ ہندوستان سے پھر ماوراء النہر ترکستان اور چین بھی

گئے تھے یہ بھی اسی روایت میں ہے کہ

لما رجع کانوا یکاتبونہ من الھند ص۱۳۱	لوگ ہندوستان سے خط و کتابت بھی حسین بن منصور (لڑکے)، والد سے کرتے تھے ۔

اور یہ روایت تو حسین بن منصور کے صاحبزادے کی ہے، اسی زمانہ میں عباسی خلیفہ معتضد باللہ نے علی بن احمد الحاسب کو ہندوستان جانے کا حکم دیا تھا علی بن احمد کے الفاظ ہیں کہ ۔

وجّھنی المعتضد الی الھند لامور تعرفھا لیقف علیھا (ص۱۷ ج ۸)	ہندوستان کے متعلق چند خاص امور کے دریافت کرنے کے لیے معتضد نے مجھے ہند روانہ کیا، خلیفہ خود ان امور سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا تھا ۔

علی الحاسب کا بیان ہے کہ جس جہاز پر سوار ہو کر ہم ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے تو دیکھا کہ اسی جہاز میں ایک شخص حسین بن منصور بھی سوار ہے ملنے جلنے بات چیت کرنے میں بہت اچھا آدمی تھا۔ جب ہم ہندوستان کے ساحل پر پہنچے اور قلیوں نے جہاز سے سامان اتارنا شروع کیا تب میں نے حسین سے پوچھا کہ :۔

ابش جئت ھاھنا	تم کس ضرورت سے یہاں (ہندوستان آئے ہو۔)

جواب میں علی الحاسب کی روایت ہے کہ حسین نے کہا کہ میں ہندوستان کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں ۔

شاید اسی جہاز میں المزین[1] نامی آدمی بھی تھا اس نے بھی حسین کو ہندوستان

[1] المزین حجام تھا یا حجاموں کو مزین اس زمانہ میں جو کہتے تھے، اس لئے المزین کے نام سے موسوم ہوا واللہ اعلم

کے ساحل پر اترتے دیکھا تھا اور اس سے بھی حسین نے کہا تھا کہ میں یہاں کے لوگوں سے سحر سیکھنا چاہتا ہوں۔ واللہ اعلم سحر کے لفظ سے مراد کیا تھی بظاہر "یوگا" یا "جوگ" جو اس ملک کے باشندوں کا خاص فن تھا اسی کا سیکھنا مقصود ہو۔ علی الحاسب کی روایت میں ہے کہ ساحل پر اترنے کے بعد میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے ایک کٹیا بنی ہوئی ہے اس میں ایک بوڑھا آدمی نظر آیا، حسین اسی بوڑھے کی کٹیا میں چلا گیا اور سحر کے متعلق باتیں دریافت کرنی شروع کیں۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی جوگی ہی سے اس کی ملاقات ہوئی تھی خود حسین کی زندگی کے تفصیلات اس کتاب میں جو پائے جاتے ہیں ان سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حسین کی زندگی مدتوں جوگیوں ہی کی زندگی رہی۔

بہرحال اس وقت نہ مجھے حسین بن منصور کی شخصیت سے بحث ہے اور نہ ان کے مسئلہ "انا الحق[1]" سے بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایک سیدھی سادی بات کو مسلمانوں کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت جو حاصل ہو گئی عموماً یہ کیفیت بیرونی موثرات ہی نے پیدا کی ہے ایسے مسائل جن میں مختلف پہلوؤں کی گنجائش ہو۔ اور "کچھ یہ بھی صحیح اور وہ بھی صحیح ہو" بجائے "کچھ" کے ایک ہی پہلو پر زور دینے کا آخری نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اصل حقیقت نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے اور آدمی مغالطہ کا شکار ہو جاتا ہے درحقیقت

[1] شنکر اچاریہ جو ساتویں صدی عیسوی یعنی ظہور اسلام کے بعد ہندوستانی مشہور ریفارمر ہیں ان کا نظریہ تھا کہ آتما اور پرماتما میں دوئی نہیں ہے ص۱۲ قرون وسطیٰ میں ہندوستانی تہذیب ۔

یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے یہ نہیں ہے کہ قرآن کو نہیں مانا تھا اور قرآن کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لائے تھے لیکن انہوں نے پیغمبر قرآن کے ساتھ تعلیمی نسبت تزکیہ سے پہلے قایم کرلی۔ حالانکہ قرآن ہی میں کہہ دیا گیا تھا کہ قرآن کی پیغمبر آیتیں تلاوت کرتے ہیں پھر ماننے والوں کے اندر کی غلطیوں کو صاف کرتے ہیں تب تعلیم دیتے ہیں[1] مگر صفائی جن کی مکمل نہیں ہوتی تھی انہوں نے قرآنی تعلیمات سے استفادہ کا ارادہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو کچھ پہلے سے ان کے پاس تھا کچھ تبدیلی اس میں ضرور ہوئی لیکن قرآنی تعلیمات بھی اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ ان میں، جاگزین نہ ہوسکے ان کا طریقۂ عمل غیر فطری تھا جس کا لازمی نتیجہ یہی ہوسکتا تھا جو ہوا۔

بہرحال اصولی اور بنیادی اختلافات جن کی وجہ سے مسلمانوں کے کسی دینی فرقہ نے اپنی دینی زندگی اور اس کے نتائج کو دوسرے مسلمانوں کی دینی زندگی اور اس کے نتائج سے الگ کرلیا ہو تفرق اور شقاقِ بعید کے اس حال کی پیدائش میں ممکن ہے، ڈھونڈنے والوں کو دوسرے اسباب کا بھی سراغ مل جائے لیکن عام حالات میں کم از کم میرا خیال یہی ہے اور اپنے محدود مطالعہ سے اسی نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اندرونی اسباب میں تو زیادہ اثر ان سیاسی اختلافات کا پڑا ہے، جن پر ابتداء

[1] يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ مشہور قرآنی آیت کا یہی اقتضا ہے۔

اسلام کے خاص پیدا کردہ ماحول کی وجہ سے مذہب اور دین کا رنگ چڑھا دیا جاتا تھا۔ کھیلنے والے دراصل سیاسی کھیل کھیلنا چاہتے تھے لیکن اپنے کھیل میں اس وقت تک وہ کامیاب نہیں ہوسکتے تھے جب تک کہ مذہب کا لبادہ اوپر سے سیاسی اغراض پر اڑھا نہ دیا جاتا۔

اسی طرح بیرونی اسباب میں سب سے زیادہ نمایاں سبب وہی نظر آتا ہے کہ اوہام و اغلاط جن میں قبل الاسلام کے ادیان لت پت تھے اور ان ہی سے پاک کرنے کے لئے خالقِ کائنات نے اپنے بندوں میں آخری رسول کو اٹھایا تھا، قرآن کے اتارنے کا بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ انسانی زندگی کا قدرتی آئین جن آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے انسانی گھرانوں میں وقتاً فوقتاً نافذ ہوتا رہتا تھا ان کتابوں میں من مانے خیالات شریک کردیئے گئے تھے۔ اپنے پیدا کرنے والے خالق کی خالص مرضی کے مطابق جی کر جو مرنا چاہتے تھے۔ ان کے لئے تسلی اور تسکین کا کوئی قابل اعتبار ذریعہ دنیا میں کسی قوم اور ملک میں آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر باقی نہ رہا تھا بطور آخری اڈیشن کے قرآن نازل کیا گیا تاکہ اپنے اپنے موروثی ادیان اور آبائی مذاہب کی مشکوک کتابوں کو قرآن پر پیش کرکر کے شک سے نکل کر یقین کی ٹھنڈی روشنی میں لوگ آجائیں۔

داخل ہونے والے اسلام میں عموماً داخل بھی اسی لئے ہوئے تھے لیکن ان میں سب کا حال ایک جیسا نہیں تھا، عزم میں جن کے خامی تھی، حوصلے جن کے زیادہ بلند نہ تھے اپنے موروثی مالوفات کے انس

والفت کے ازالہ پر جیسا کہ چاہیئے تھا قادر نہ ہو سکے جس کی تطہیر و تزکیہ کی اس راہ میں بہر حال ضرورت تھی۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر آبائی اوہام و اغلاط اور اسلامی تعلیمات میں تطبیق و توفیق کی نکوہیدہ کوششوں میں وہ مشغول ہو گئے اسی نامبارک سعی اور غلط اقدام نے عجیب و غریب نظریات و خیالات کو مسلمانوں میں پھیلا کر مختلف ٹولیوں میں ان کو بانٹ دیا تھا، دین اسلامی کی تاریخ کا یہ بڑا مبسوط مضمون ہے۔ تاہم بقدر ضرورت اس سلسلہ میں جو کچھ پیش کیا جا چکا ہے۔ اگر پڑھنے والوں نے توجہ سے اس کو پڑھ لیا ہے تو شاید وہ بھی اسی نتیجہ تک پہنچ چکے ہوں گے جس نتیجہ تک مطالعہ اور جستجو نے مجھے پہنچایا ہے۔

اس کے بعد خود سوچنا چاہیئے کہ سیاسی جوڑ توڑ کے لئے مذہبی سو آنگ اختیار کرنے والوں نے جن فرقوں کو مسلمانوں میں پیدا کر دیا تھا ان کا جو انجام ہوا، اس کے سوا دوسرا انجام ان کا آخری ہو ہی کیا سکتا تھا یہ سیاسی قصے زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ میدان میں ایک پارٹی آتی ہے۔ کھیلتی ہے ہنگامے مچاتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ انسانیت کی تاریخ سیاسی بازی گریوں کے ان تماشوں سے بھری ہوئی ہے، مسلمانوں کی تاریخ میں بھی یہی کھیل کھیلے گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیاسی شاطروں کے ساتھ شطرنج کی وہ بساط بھی الٹتی چلی گئی جو وقتاً فوقتاً بچھتی رہی اور ان کے ساتھ وہ فرقے بھی ختم ہوتے چلے گئے جو پیدا وار

ہی تھے ایک ایسے زمانہ کے سیاسی ہنگاموں کی جس میں مذہب کی چھاپ کے بغیر کوئی چیز چل ہی نہیں سکتی تھی۔ آخر آج ان ازراقہ کو ہم کہاں ڈھونڈیں، جو کہتے پھرتے تھے کہ

بعض دلچسپ سیاسی نظریئے

کہ دینی نصب العین اور "اقامتِ حق" کی جو مہم ہم لوگوں نے اٹھائی ہے اس میں جو شریک نہ ہوگا خواہ ہمارے دشمنوں کی مدد بھی نہ کرے ناطرف دار ہی رہے لیکن وہ بھی اسلامی دین کے دائرے سے خارج ہو گیا اور اپنا ٹھکانہ اس نے جہنم کو بنا لیا۔

انہ کفر القعدۃ وھو، اول ما اظھر البرأۃ من القعدۃ علی القتال و ان کان موافقا علی دینہ وکفر من لم یھاجر الیہ

ص۱۲۹

(شہرستانی ج ۱)

ازراقہ کا لیڈر ابن ازرق پہلا آدمی تھا جس نے ان لوگوں کو کافر قرار دیا جنہوں نے اس کی سیاسی کشمکش میں بجائے ساتھ دینے کے بیٹھے رہے اور ان لوگوں سے بھی علیحدگی کا اس نے اعلان کیا جو مخالفوں سے جنگ کرنے میں اس کے ساتھ نہ اٹھے، خواہ دین کے دوسرے معاملات میں وہ ان کے ہمنوا ہی کیوں نہ ہوں ازراقہ یہ بھی کہتے تھے کہ ہجرت کر کے جو ان کے ساتھ آکر نہ ملا ایسا مسلمان کافر ہو گیا۔

یہی ان کا سیاسی کہئے یا دینی عقیدہ تھا۔

یا ان عزیب "بخدات عاذریہ" کا سراغ دنیا کے کس گوشہ میں لگایا

جاسکتا ہے جو گویا مسلمانوں کے نہلسٹ تھے اور کہتے پھرتے تھے کہ :۔

لاحاجة للناس الی الامام	امام (یعنی کسی منظم حکومت) کی کوئی ضرورت نہیں
قط انما علیهم ان یتناصفوا	ہے لوگوں پر صرف یہ فرض ہے کہ آپس کے معاملات
فیما بینهم من ۱۲۲ ج ا ش	کو انصاف کے ساتھ خود چکا لیا کریں ۔

جہاں اس فرقہ کا لیڈر نجدہ بن عامر گیا وہیں یہ سیاسی عقیدہ بھی دفن ہوگیا جس پر دینی اعتقاد کا خول اوپر سے مڑھ دیا گیا تھا ۔

بتایا جائے کہ مسلمان بادشاہوں اور ائمہ کے مقابلہ میں جنہوں نے یہ فیصلہ کرکے اسی کو اپنا دین بنالیا تھا کہ :۔

"ہم بادشاہوں اور صرف ان مسلمانوں کے قتل کو مذہبی فرض خیال کرتے ہیں، جو ان حکمرانوں کے حامی اور مددگار ہیں اور ان کے احکام کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن جو حکمرانوں پر اعتراض کرتے ہیں اور ان سے راضی نہیں ہیں، ان مسلمانوں کو ہم قتل نہیں کریں گے، ہاں ان حکومتوں کی طرف سے جاسوسی کا کام جو انجام دیں گے ہم ان کو بھی تلوار کے حوالہ کردیں گے" صـ۱۳۲ ج ا شہرستانی ۔

میمونیہ فرقہ جس کا قائد میمون بن خالد تھا اس کا یہی عقیدہ تھا لیکن نہ اب میمون ہی دنیا میں زندہ رہے اور نہ بے چارے میمونیہ عرب کے بیابان میں اپنے لیڈر کے ساتھ وہ بھی گم ہوگئے ۔

عبداللہ بن اباض جس کا دعویٰ تھا کہ

"قبلہ کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے والوں میں جو ہمارے مخالف ہیں، ہم ان کو مشرک تو نہیں سمجھتے، لیکن چونکہ ہمارے مخالف ہیں اس لئے کافر قرار دے کر ان کے مال کو مالِ غنیمت ہم بنا سکتے ہیں اور ان کے ہتھیار اور گھوڑے چھین لیں گے، اگرچہ اسی کے ساتھ ان کی عورتوں کے ساتھ نکاح بھی جائز ہے اور ان کے مال کے ہم وارث بھی بن سکتے ہیں ۔"

مسلمانوں کے عام ممالک کے متعلق ان کا خیال تھا کہ دارالاسلام تو نہیں لیکن دارالتوحید ان کو کہنا چاہیئے لیکن حکومت کی فوجی چھاؤنیاں جن علاقوں میں قائم ہیں وہ دارالتوحید بھی نہیں ہیں۔ بلکہ دارالتقی ہیں" صـ۱۴۱ ۔

بتایا جائے کہ اسی ابن اباض کی طرف منسوب کرکے "اباضیہ" نامی جس فرقہ کا ذکر کیا جاتا ہے کتابوں کے سوا سطح زمین پر کہاں مل سکتا ہے اسی طرح حالات نے اسلام کی ابتدائی صدیوں ہی میں اس قسم کے خیال کے لوگوں کو جو پیدا کردیا تھا، جنہوں نے دنیا کو دو حصوں میں بانٹا تھا جہاں اسلامی احکام کا اعلان واظہار کھلے بندوں بے روک ٹوک جاری ہو، ان علاقوں کا نام ان کی اصطلاح میں "دارالعلانیہ" تھا اور جہاں مسلمانوں کو اس قسم کی آزادی حاصل نہ ہو اس کا نام انہوں نے "دارالتقیہ" رکھا تھا، اس تقسیم کے ساتھ یہ اس کے بھی قائل تھے کہ :۔

"دار التقیہ میں مسلمان عورتوں کا نکاح اپنی قوم کے ان افراد
کے ساتھ جائز ہے۔ جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا مگر دار العلانیہ
میں اسکی اجازت نہیں دی جاسکتی" صد۲۴۳ ج اثش۔

اوران باتوں کی تفصیل کہاں تک کی جائے حد یہ ہے کہ اس قسم کے روشن خیال بھی ان ہی سیاسی چکروں سے مسلمانوں میں پیدا ہو چکے تھے جو کہتے تھے کہ:-

اسلام کے دینی اصطلاحات کی شرح مصلحت وقت کے
مطابق کرنے کا ہمیں اختیار ہے ہوسکتا ہے کہ ہم کعبہ کے
حج کی تشریح کرتے ہوئے یہ کہیں کہ کعبہ عرب میں نہیں ہے
بلکہ لعلہا بالہند دبلکہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان میں ہو"
صد۲۴۶ ج اشہرستانی۔

تشریح کے ان اطلاقی اختیارات کے ساتھ مسلمان صرف وہ اپنے آپ ہی کو سمجھتے تھے یہ دعویٰ "غسانیوں" کا تھا جن کا لیڈر غسان الکوفی تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خوارج جن کے متعلق سنا جاتا ہے کہ اب بھی ان کی تھوڑی بہت تعداد عرب کے بعض ساحلی علاقوں (مسقط عمان) وغیرہ میں پائی جاتی ہے اور مغرب اقصیٰ (مراکش وغیرہ) کے کوہستانی خطوں میں سیاحوں کا بیان ہے کہ قدیم خارجیوں کے نام لیواؤں سے ان کی ملاقات ہوئی تھی، نہیں کہا جاسکتا کہ دور افتادہ گوشوں میں واقعی ان خارجیوں کی صحیح تعداد کیا ہے کچھ بھی ہو لیکن چند لاکھ تک بھی ان کی گنتی

اگر پہنچ جائے تو شاید اس سے زیادہ تخمینہ ان کا کیا بھی نہیں جاسکتا۔

چند لاکھ خوارج کے بعد ابتداء اسلام کی سیاسی کش مکش سے پیدا ہونے والے اسلامی فرقوں میں کوئی فرقہ صحیح معنوں میں اگر باقی رہ گیا ہے تو وہ شیعوں کا فرقہ ہے لیکن "شیعہ" کے اسی لفظ میں میرا خیال ہے کہ سیاسی قصوں سے پیدا ہونے والے دینی فرقوں کی تاریخ پوشیدہ ہے۔

لفظ شیعہ کا مطلب

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اب تو "شیعہ" کے اس لفظ سے جیسا کہ سب جانتے ہیں مسلمانوں کا ایک خاص فرقہ سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت اسلام کی ابتدائی صدیوں کی سیاست کی یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے یعنی موجودہ زمانہ میں "پارٹی" کے لفظ کا اس زمانہ میں تھا اسلامی تاریخ کا تھوڑا بہت مطالعہ بھی جن لوگوں نے کیا ہے وہ اس سے واقف ہیں۔ مثلاً اس موقعہ پر بے ساختہ ابن عساکر کی تاریخ دمشق کی ایک بات یاد آگئی، عباسیوں کا دوسرا خلیفہ ابو جعفر منصور اپنے دربار میں بیٹھا ہوا تھا اچانک درباریوں کی طرف خطاب کرکے ایک دن اس نے دریافت کیا۔

حجاج (مشہور ظالم امت) کا وصیت نامہ کسی کو یاد ہے؟۔

دنیا کی عام تاریخ کے متعلق تو میں دعویٰ نہیں کرسکتا لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں "ڈکٹیٹرشپ" کے طرق حکمرانی کا حجاج اپنے وقت میں شاید سب سے بڑا امام تھا بنی امیہ کی حکومت کے حکمرانوں کو اسی نے مطلق

العنان ڈکٹیٹر کی حیثیت سے خود بھی مانتا تھا اور چاہتا تھا کہ دوسرے بھی ان کو حکومت کا ڈکٹیٹر تسلیم کرلیں، اس باب میں ہلکی سی مخالفت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی، واقعات کا ایک ذخیرہ اس باب میں تاریخ کی کتابوں میں پایا جاتا ہے[1] اپنے اسی نقطہ نظر سے مرتے ہوئے حجاج نے وصیت نامہ لکھوایا تھا جس میں کلمۂ شہادت کے بعد تھا۔

"ولید بن عبدالملک (جو اس کے زمانہ میں بنی امیہ کا حکمراں تھا)
اس کی فرماں برداری اور طاعت کے سوا حجاج اور کچھ نہیں
جانتا اسی عہد پہ وہ زندہ رہا اور اسی پر وہ مرا اور اسی عہد پہ
قیامت کے دن وہ اٹھے گا۔"

آمریت اور حجاج [1] ولید بن عبدالملک کے دریافت کرنے پر حجاج نے خود ہی کہا تھا کہ لبنان اور سنیر (شام کا ایک پہاڑ) اگر ان دونوں پہاڑوں کے برابر زر خالص مجھے مل جائے اور سب کو خدا کی راہ میں خرچ کردوں جب بھی میری یہ نیکی اس اطاعت اور فرماں برداری کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے۔ جو میرے دل میں آپ کی طرف سے پائی جاتی ہے اس نے کہا کہ مسلمانوں کا جتنا خون بھی اس سلسلہ میں یعنی ولید کے لوگ مطیع ہو جائیں میں نے بہایا ہے اس خون کی نہ مجھے پروا ہے اور نہ اس کا خوف، یاد رکھنا چاہیے کہ ایک لاکھ سے زائد مسلمانوں کو ستون میں باندھ کر اس ظالم نے اسی سلسلہ میں قتل کرایا تھا کہتا تھا کہ اللہ سے ڈرتے یعنی تقویٰ کے لئے تو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فرمایا گیا ہے لیکن اسی کے بعد وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا (سنو اور اطاعت کرو) کے حکم کو قرآن نے استطاعت کے ساتھ مشروط نہیں کیا ہے ۱۲ ص۶۸ ج۴ ابن عساکر۔

وصیت نامہ کے عربی الفاظ جن کا ترجمہ میں نے درج کیا ہے ابو جعفر منصور نے ان کو سن کر دربار والوں سے کہا کہ :-

هٰذه واللّٰه الشيعة لا شيعتكم　　　یہ ہے شیعہ، نہ کہ تمہارے شیعہ

(تاریخ دمشق ابن عساکر ص۶۹ ج۴)

مطلب یہ تھا کہ پارٹی کے ساتھ وفاداری کی اصل حقیقت یہ ہے کہ زندگی و موت دنیا اور آخرت تک سب وفاداری کے جذبات میں غرق ہو جائیں۔ ابو جعفر کو اپنی پارٹی سے شکایت تھی کہ ہمارے شیعہ یعنی پارٹی میں وفاداری کا یہ بے پناہ جذبہ نہیں پایا جاتا۔

میں ابو جعفر منصور کے ان ہی الفاظ کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں اس زمانہ کی ایک سیاسی اصطلاح اس سے سمجھ میں آتی ہے یعنی اہل بیت نبوت یا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامیوں کی پارٹی ہی کو شیعہ نہیں کہتے تھے بلکہ "شیعہ" کا لفظ عام تھا جس کی اضافت عباسیوں، امویوں اہل بیت وغیرہ سب ہی کی طرف کی جاتی تھی۔ بنی امیہ کے حامیوں اور پارٹی والوں کو شیعہ بنی امیہ، عباسیوں کی پارٹی والے شیعہ بنی عباس کہلاتے تھے، جیسے شیعہ علی یا شیعہ اہل بیت ان لوگوں کی تعبیر تھی، جن پر اب مطلق "شیعہ" کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال اسی لئے تو پیش آئی کہ سارے مضاف الیہ جس کی طرف شیعہ کا یہ لفظ منسوب ہو کر استعمال ہوتا تھا یکے بعد دیگرے ختم ہوتے چلے گئے تا آنکہ "پارٹی" یا "شیعہ" ہونے کی حیثیت

سے صرف وہی لوگ رہ گئے جو اپنے آپ کو اہل بیت اور حضرت علیؓ کی پارٹی میں شمار کرتے تھے۔

اور یہی میرا مقصد ہے کہ "شیعہ" کے لفظ کا جو مفہوم اب ہو گیا ہے۔ یہ خود بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی بے شمار سیاسی پارٹیاں پیدا ہو ہو کر ختم ہوتی چلی گئیں پارٹیاں جنہوں نے مذہب کا چولا پہن لیا تھا ایسے وسے کہ صرف ایک پارٹی اہل بیت کی حمایت کا دعویٰ کرنے والی باقی رہ گئی ہے۔ جن کو ہم اب "شیعہ" کہتے ہیں۔

اور سیاسی راہ سے پیدا ہونے والے فرقوں میں تو خیر شیعوں کا یہ فرقہ باقی رہ گیا ہے لیکن اسلامی دین کے دائرے میں داخل ہونے والی قوموں کے جن مذہبی الائشوں سے متاثر ہو کر مسلمان میں جو فرقے پیدا ہوئے تھے ان کا حال تو اس۔ سے بھی زیادہ عجیب ہے اور تو اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ باتونی منہ زور قلم کے دھنی جتنی فرقہ معتزلہ کا تھا۔ جسے وقتاً فوقتاً عباسی حکومت کی پشت پناہی بھی حاصل ہوتی رہی۔ بعض خلفا پر بھی اعتزالی رنگ چڑھ گیا تھا اور وزراء و قاضی القضاۃ وغیرہ جیسے اقتداری عہدوں پر بھی اس فرقہ کے فضلا و علماء قابض رہے ان کے ہاتھ میں قلم کے ساتھ تلوار اور تلوار کے ساتھ قلم بھی تھا معرکتہ الآرا کتابیں اپنے خیالات و عقائد کی تائید میں اس فرقہ کے اہل قلم نے لکھیں یہ سب کچھ ہوا مگر جیسا کہ طاش کبریٰ زادہ کا بیان ہے نقل کرا چکا ہوں۔

کان علم الکلام بایدی المعتزلة — معتزلہ کے ہاتھ میں علم کلام کی باگ دو سو

ماتئی سنة مابین المائة والثلاث مائة ص۳ مفتاح العادة — سال تک رہی یعنی پہلی صدی سے اور تیسری صدی کے درمیان میں۔

گویا تیسری صدی سے معتزلہ کا زور ختم ہونے لگا اور آج حال یہ ہے کہ بجز چند غیر کلامی کتابوں کے مثلاً زمخشری کی تفسیر کشاف، یا لغت کی بعض کتابوں کے سواد نیا کے کتب خانوں میں فرقہ معتزلہ کے مصنفین کی ان کتابوں کا ایک ورق بھی مشکل ہی سے مل سکتا ہے جو اعتزالی عقائد وخیالات کی تائید میں لکھی گئی تھیں کہہ چکا ہوں کہ آج اس فرقہ کے متعلق ہم جو کچھ بھی جانتے ہیں وہ صرف اہل السنت والجماعت کی کتابوں کا صدقہ ہے کہ تردیداً جواب دینے کے لئے انہوں نے اعتزالی عقائد کا تذکرہ اپنی کتابوں میں کر دیا تھا۔

اور جب معتزلہ کا یہ حشر ہوا تو نسبتاً جن فرقوں کے پاس نہ معتزلہ کی قوت تھی نہ دولت، نہ علم نہ فضل، بھلا وہ بے چارے کیسے زندہ رہ سکتے تھے میرا تو خیال یہی ہے کہ جیسے جیسے نسلیں گزرتی گئیں ان کا تعلق قدرتاً ان اوہام و خرافات سے کمزور ہوتا چلا گیا، جنہیں ان کے آباواجداد اپنے ساتھ لائے تھے۔ خالص اسلامی تعلیمات کی روح سے بہ نسبت اپنے اسلاف کے اخلاف زیادہ قریب ہوتے چلے گئے تا اینکہ وہ وقت بھی آگیا کہ سارے موروثی رجحانات، نومسلم خاندانوں سے مٹ مٹا کر ختم ہو گئے۔ اس راہ سے پیدا ہونے والے فرقوں کا صرف نام ہی نام اب کتابوں میں رہ گیا ہے اس سلسلہ میں معتزلہ ہی کیا دنیا کے پردے پر کرامیہ مرجیہ جہمیہ وغیرہ وغیرہ،

کہاں مل سکتے ہیں؛ اس لحاظ سے بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے اور یہی کہنا چاہیئے کہ ایشیا و افریقہ بلکہ یورپ و امریکہ کے انسانوں میں "اسلامی برادری" قرآن کی بدولت جو قائم ہو گئی ہے اور ستر کروڑ سے پچاس کروڑ تک اس قرآنی برادری میں شریک ہونے والوں کی تعداد کا تخمینہ آج جو کیا جا رہا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس امت میں شیعوں کے سوا صرف ایک فرقہ اہل السنت والجماعت ہی کا باقی رہ گیا ہے اس میں شک نہیں کہ خوارج کی طرح شیعوں کی تعداد ناقابل لحاظ نہیں ہے لیکن جہاں تک میرا تخمینہ ہے اہلسنت والجماعت کے مقابلہ میں ہزار میں ایک کی نسبت بھی شیعوں کی ثابت ہو جائے تو اس سے زیادہ بڑا تخمینہ ان کے متعلق شاید کیا بھی نہیں جا سکتا گویا مسلمانوں میں ایسے فرقے جن کے اختلافات بنیادی اختلافات قرار دئیے جا سکتے ہیں لے دے کر صحیح معنوں میں ان ہی دو فرقوں کے اندر منحصر ہو کر رہ جاتے ہیں اور خواہ مخواہ کا بھی اضافہ اگر کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کے فرقوں کو بہر حال تین سے زیادہ تو کسی طرح آگے بڑھایا نہیں جا سکتا۔

باقی مسلمانوں میں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ ناموں سے جو کچھ سمجھا جاتا ہے کیا اس کو "فرقہ بندی" کے نیچے ہم داخل کر سکتے ہیں۔ آئیے اس داستان کو بھی سن لیجئے۔

سیاسی مقاصد و اغراض کی راہوں میں مذہب اور دین کے نام سے ناجائز نفع اٹھانے والوں کی طرف سے نت نئی بازی گریاں اسلام کی ابتدائی

صدیوں میں جو کھیلی گئیں، یا باہر سے مختلف رجحانات کے جراثیم مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً جو منتقل ہوتے رہے اس سلسلہ میں اختلافات کی جو صورتیں پیدا ہوئیں، رنگ رنگ کے بوقلموں شگوفے جو کھلے ان کے تاریخی نمونے تو گزر چکے، عرض کر چکا ہوں کہ ہونے کو تو یہ سب کچھ ہوا اور ان ہی کی بدولت "ملل ونحل" کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں اسلامی فرقوں کی فہرست کافی طویل و عریض نظر آتی ہے ستر بہتر ہی کیا گننے کے لئے کوئی بیٹھے تو شاید ان کی تعداد سیکڑوں سے بھی متجاوز ہو جائے اسی لئے بہتر تہتر فرقہ والی زبان زد عام روایت کا مطلب بعضوں کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی خاص عدد مراد نہیں ہے، بلکہ عربی زبان کے محاورے کی بنیاد پر یہ سمجھنا چاہیئے کہ فرقوں کی زیادتی و کثرت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اس میں شک نہیں کہ پوری ہونے کی حد تک یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور کتابوں میں جن فرقوں کا، اور ان کی اعتقادی و عملی خصوصیتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے، یہ فرضی واقعات نہیں ہیں۔

نہ سوچنے والے اسلامی فرقوں کی اسی ضخیم و کبیر فہرست کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں حالانکہ کتابوں کے اوراق سے ہٹ کر چاہیئے تھا کہ واقعہ کی جو صورت اب ہو گئی ہے اس کا بھی جائزہ لیا جاتا، بتا چکا ہوں اور جو چیز سامنے کی ہے اس کے لئے بتانے کی کیا ضرورت ہے، آخر مسلمان قوم یا امت اسلامیہ زمین کے اسی خاکی کرے کے باشندوں کا تو ایک گروہ ہے۔ میں بار بار اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتا چلا آرہا ہوں کہ شیعوں

کے سوا عدداً بمشکل ہزار میں ایک کی نسبت عام مسلمانوں کے ساتھ رکھتے ہیں، اس لئے خود شیعوں کی عام فقہی اور دینی کتابوں میں غیر شیعی مسلمانوں کی تعبیر ہی ''العامہ'' کے لفظ سے کی جاتی ہے۔

بس ان شیعوں کے سوا بتایا جائے کہ اہلسنت والجماعت یا عوام جن کو سنی مسلمان کہتے ہیں اب مسلمانوں میں دنیا کے اس پردے پر صحیح معنوں میں دیکھئے تو سہی کہیں کسی فرقہ کا پتہ بھی ہے؟۔

میں نے پہلے بھی کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ اسلام کے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کا کوئی دوسرا کارنامہ نہ بھی ہوتا تو یہی عجیب وغریب معجزانہ کامیابی کہ کسی خاص ملک، خاص قوم، خاص نسل کے لوگوں میں نہیں بلکہ عام بنی نوع انسانی میں ایک ایسی عظیم الشان، طویل الذیل برادری آپ کے طفیل میں قائم ہوگئی، جس میں سامی نسل والے بھی شریک ہیں اور وہ بھی جن میں آریوں کا خون ہے، تاتاری بھی ان میں ہیں اور منگولی بھی، حبشی بھی ہیں اور سوڈانی بھی، ایشیائی بھی ہیں اور افریقی بھی، بلکہ کافی تعداد یورپ کے باشندوں کی بھی ہے، اور امریکہ کی جدید دنیا بھی ان سے خالی نہیں ہے الغرض ان میں گورے، کالے، گندمی، بادامی سب رنگ کے آدمی دینی یک رنگی کے رشتہ کو قائم کر کے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل گئے عالمی اخوت اور برادری کا یہ دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

یہی سوچنے کی بات ہے کہ دس بیس، لاکھ کی تعداد میں نہیں بلکہ قریب

قریب نصف ارب سے زیادہ تخمینہ اس انسانی برادری میں شریک ہونے والوں کا کیا جاتا ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اس وقت تک دنیا میں قائم ہو چکی ہے کیسی عجیب بات ہے کہ بھانت بھانت کی نسلوں، زبانوں، رنگوں کے باوجود ان کی سب سے بڑی اکثریت میں ''سنی عقیدہ'' اور طرز زندگی کے سوا کوئی دوسرا دینی رنگ نہیں پایا جاتا۔

صرف یہی نہیں، بلکہ دین میں ان سے جو مختلف ہیں عرض کر چکا ہوں کہ ان ہی اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے ساتھ ان کے پیغمبر نے (صلوٰت ہوان پر سلام ہوان پر) اس انسانی برادری کا ایک ایسا رشتہ قائم کر دیا ہے کہ اہل کتاب جن جن بزرگوں کو اپنے دینی پیشواؤں اور مذہبی راہنماؤں میں وہ شمار کرتے ہیں وہ نوح ہوں یا ابراہیم موسیٰ ہوں، یا عیسیٰ داؤد ہوں یا سلیمان زکریا ہوں یا یحییٰ (علیہم السلام) سب ہی پر ایمان لانا اسی طرح ضروری سمجھتے ہیں اور اسی کو اپنا دینی عقیدہ یقین کرتے ہیں جیسے اپنے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ مانتے ہیں اس برادری کا ہر فرد اپنے آپ کو اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے ان بزرگوں کا صحیح وارث اور سب ہی کا نام لیوا بنا ہوا ہے ان کا قرینی نعرہ ہی یہ ہے کہ:۔

دردل حق سر مکنونیم ما   وارث موسیٰؑ و ہارونیم ما

ان کے خواص ہی کا نہیں بلکہ عوام کا بھی جزءِ ایمان یہی عقیدہ ہے ذکر کر چکا ہوں کہ بات صرف باطنی احساسات ہی کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ اہل کتاب کے ساتھ رشتہ مناکحت کی اجازت بھی سارے آسمانی

تو یان کی تصدیق و توثیق کرنے والی اس انسانی برادری کو دی گئی اسی اجازت کے مطابق عمل بھی جاری ہے۔

مسجد نبوی میں عیسائیوں کو نماز پڑھنے کی اجازت رسول صلعم

اور یہ رشتہ تو خیر گو نہ ایک دنیاوی تعلق کی شکل ہے، دین اور دین کا بھی سب سے اہم امتیازی عنصر عبادت پوجا پاٹ تک کی اجازت خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کی عبادت گاہ بلکہ اس مسجد اقدس میں دی جو کعبہ کے بعد مسلمانوں کے نزدیک دنیا کی مسجدوں اور عبادت گاہوں میں سب سے زیادہ احترام کی مستحق ہے، آخر کون نہیں جانتا کہ نجرانی عیسائیوں کا جو وفد دربار نبوت میں حاضر ہوا تھا۔ صحیح روایتوں میں ہے کہ ان عیسائیوں نے مدینہ منورہ کی مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے

صلوا صلاتهم زاد المعاد ص۳۱ بہ زرقانی — اپنے طریقہ سے نماز پڑھی یعنی عبادت کی

لوگ سوچتے نہیں ورنہ العالمین کی رحمت کا دامن تو اس سے بھی زیادہ فراخ اور وسیع تھا، ثقیف کے بت پرست مشرکین کا وفد

طائف والوں کو مسجد میں ٹھیرایا گیا

طائف سے جب مدینہ پہنچا تو دیکھئے سیرت طیبہ کی عام کتابوں میں

یہ واقعہ آپ کو مل جائے گا کہ:

لما قدموا على رسول الله صلى الله عليه وسلم ضرب عليهم قبة في ناحية المسجد ص۴ ج۳ زرقانی — جب ثقیف والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو مسجد نبوی کے ایک گوشہ میں ان کے لئے خیمہ قائم کیا گیا جس میں وہ ٹھیرائے گئے۔

حالانکہ خیمہ قائم کرنے کے لئے مدینہ میں بھلا جگہ کی کوئی کمی تھی لیکن مسلمان تو مسلمان، اہل کتاب تک طائف والے نہ تھے۔ لات نامی بت کے پوجاری تھے اور وہ سب کچھ تھے جو جاہلیت میں عرب کے عام باشندے ہو سکتے تھے۔ لیکن بایں ہمہ خیمہ ان کا مسجد نبوی کے ایک ناحیہ اور گوشہ ہی میں قائم کیا گیا۔ شمس الائمہ سرخسی نے شرح سیر کبیر میں اسی روایت کا ذکر کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ بعضوں نے کہا بھی کہ یہ لوگ تو ناپاک ہیں جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ليس على الارض من نجاستهم شيء ص۹۲ ج۱ — ان کی ناپاکی کا زمین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حق تو یہ ہے، کہ بات کچھ مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے، یہی اپنا وطن ہندوستان ہے، اس میں "جات پات" کی ہتھوڑیوں سے انسانیت توڑی گئی تا آنکہ ان گنت طبقات میں یہاں کی آبادی بٹ گئی۔

چھوت چھات کا مقابلہ اسلامی نقطہ نظر سے

بٹ گئی اور کس حد تک بٹی، کہ باوجود آدمی ہونے کے دوسرا آدمی ہی یہ سمجھتا ہے اور سمجھ کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے کہ اس کے چھو جانے سے وہ ناپاک ہو جائے گا کتے چھولیں، بلیاں، چھولیں گھوڑے چھولیں آدمی پھر بھی پاک ہی رہتا ہے لیکن آدمی آدمی کو چھولے، چھونے والا اور جو چھوا گیا، دونوں ناپاک ہو گئے چھونے سے ان کا کھانا ناپاک ہو جاتا ہے۔ پانی ناپاک ہو جاتا ہے، قیمتی سے قیمتی چیزیں اس احساس کے زیر اثر آئے دن برباد ہوتی رہتی ہیں، پھینک دی جاتی ہیں سمجھ لیا جاتا ہے کہ کوڑی کام کی نہ رہیں اس وہمی تاثر کے لئے نہ نسلوں کے اختلاف کی ضرورت ہے نہ ملکوں کے اختلاف کی نہ زبانوں کے اختلاف کی، نہ رنگوں کے اختلاف کی، حتیٰ کہ دینی اختلاف کی بھی) ضرورت نہیں ایک ہی نسل ایک ہی ملک، ایک ہی زبان کے بولنے والے ایک ہی رنگ والے بلکہ دینی حیثیت سے جس نام سے چھونے والا پکارا جاتا ہے اسی دینی نام سے چھو جانے والا بھی موسوم ہوتا ہے الغرض چھونے والا بھی اپنا دھرم وہی بتاتا ہے جو دھرم چھوئے جانے والے کا ہے، بایں ہمہ "چھو جانے" کے قانون کے تحت اگر اس کا چھونا بھی داخل ہے تو ناپاک ہو جانے اور ناپاک کر دینے کے لئے باہمی مساس یا چھوا چھوت ایک دوسرے کا کافی ہے۔

ہم یہ بھی دیکھتے ہیں، دیکھ رہے ہیں آگے پیچھے دائیں بائیں بھی تماشے ہمارے سامنے آئے دن گزرتے رہتے ہیں اس کے فقہ اسلامی کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں یہ پڑھ کر گزرتے بھی رہتے ہیں کہ:۔

سور الادمی مطلقا ولو کافرا" — آدمی کا جھوٹا پاک ہے خواہ کسی قسم کا آدمی ہو
طاهر طهور بلا کراهة — کوئی ہو کافر غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو بغیر کسی ناپسندیدگی کے
شامی ص ۲۰۵ ج ۱ — اس کو پاک سمجھنا چاہئے۔

اور کیا یہ پانی صرف خود پاک ہے؟ سنئے مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ،

ای مطهر لغیره من الاحداث — خود بھی وہ پانی پاک ہے اور دوسروں کو بھی پاک
والاخباث (شامی ص ۲۰۵ ج ۱) — کرتا ہے ہر قسم کی ناپاکیوں اور گندگیوں سے۔

مطلب جس کا یہ ہوا کہ اس پانی سے وضو کر کے نماز پڑھنا، قرآن چھونا سب کچھ درست ہے۔

ہم گزر جاتے ہیں اور کچھ اندازہ نہیں کرتے کہ ٹوٹی ہوئی انسانیت کو اس کے آخری جوڑنے والے نے جوڑنے میں اپنی سرگرمیوں کو کہاں تک پہنچا دیا تھا، جھوٹا۔ ایسے آدمی کا جھوٹا جو مسلمان نہیں ہے اس کو مسلمان صرف کھا پی ہی نہیں سکتے ہیں بلکہ ایسے جھوٹے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھ بھی لا کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین نے آدم کے بچوں کو کھڑا کر دیا صلوٰت ہو ان پر، سلام ہو ان پر، اللہ اللہ بات کہاں سے کہاں جا پہنچی،

انسانیت کے اس سب سے بڑے بہی خواہ کا خیال آتا ہے اور آنکھیں پر نم ہو جاتی ہیں، ان قدموں پر نہ لوٹیے تو آخر کس پر لوٹیے، جس

نے خاک سے اٹھا کر آدم کی اولاد کو کاخ تک پہنچایا۔

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے است

کا نعرہ لگاتے ہوئے مسلمانوں نے زمین کے مختلف حصّوں کو آج اپنا وطن بنالیا، اور وطن بنا لینے میں کامیاب ہوئے۔ کیا چھوت چھات کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے بعد بھی اس میں وہ کامیاب ہو سکتے تھے۔

قومیں ابھی سوچ رہی ہیں بچھڑے ہوئے باہم ایک دوسرے سے بغل گیر ہونے کی تجویزیں ہی پاس کر رہے ہیں آمادہ کیا جا رہا ہے کہ ہر آدمی دوسرے آدمی کو آدمی سمجھے، اپنا بھائی خیال کرے۔

لیکن جو کچھ سوچا جا رہا ہے وہ سب کچھ کیا جا چکا اور یقین مانئے کہ جو کچھ بھی آئندہ ہو گا وہ "وحدتِ انسانی" اور انسانیت کے احترام" کے اسی پیغام کی تعمیلی شکل ہو گی۔

اہلسنت والجماعت میں کوئی فرقہ نہیں ہے

خیر میں بہت دور نکلا چلا جا رہا ہوں ورنہ بات کہنے کی آخر میں جو رہ گئی تھی، وہ صرف یہ تھی کہ مسلمانوں کے جس طبقہ کی تعبیر اہل السنت والجماعت یا سنی مسلمانوں سے میں کر رہا ان کے متعلق نہ جاننے والوں پر شاید میرا یہ دعویٰ گراں گزر رہا ہو گا کہ سنی مسلمانوں میں دینی اختلاف یعنی ایسا دینی اختلاف نہیں ہے جس کی وجہ سے ایک کے دین کو سمجھا جائے کہ دوسرے کے دین سے جدا ہو گیا قرآنی تعبیر میں کہہ سکتے ہیں کہ۔

اَلَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا (الانعام) — جنہوں نے جدا جدا کر لیا اپنے دین کو اور بن گئے وہ ٹولیاں۔

کا صحیح مصداق جن کے اختلاف کو ہم نہیں ٹھہرا سکتے اور اس قرآنی حکم[1] کے وہ مجرم نہیں ہیں۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا (آلِ عمران) — اور نہ ہو جانا ان لوگوں کی طرح جو جدا جدا ہو گئے اور اختلاف کیا۔

بلاشبہ میرا یہی دعویٰ ہے گرانیوں کا ازالہ واقعات کے علم کے بعد خود بخود ہو جائے گا اسی داستان پر میرا یہ مختصر مقالہ ختم ہو گا انشاء اللہ۔

کہنا یہ ہے کہ باہم وحدت و یکسانیت جو انسانی افراد میں پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے خواہ ہم پہچانتے ہوں یا نہ پہچانتے ہوں کسی آدمی کو دیکھ کر ہم یقین کر لیتے ہیں کہ وہ گھوڑا یا بیل نہیں بلکہ ہمارا جنس انسان ہی ہے وحدت کے ان عام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ہم میں ہر فرد بشر اپنے ابنائے جنس کے دوسرے افراد کے درمیان ممتاز ہو جاتا ہے زید زید ہے عمرو نہیں ہے، ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد خط و خال ہیئت و صورت، شکل و شمائل کے اختلاف ہی پر تو قائم ہے ان اختلافات کی حد یہ ہے کہ عموماً ہم میں دو آدمیوں کی آواز بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتی آواز نہیں ملتی، چال نہیں ملتی، خط نہیں ملتا خال نہیں ملتا اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ

[1] اس حدیث میں قابل غور یہی بات ہے کہ تفرق (جدا جدا ہو جانے کے بعد) اختلاف سے ممانعت کی گئی ہے نہ کہ نفس اختلاف سے۔

کروڑوں میں بھی تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے نشانات ہر ایک کے اپنی خصوصیتوں کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں، حکومتیں اپنے فیصلوں میں "نشان ابہام" کے ان ہی فطری امتیازات پر اعتماد کرتی ہیں۔

اور جو حال باہر کا ہے یہی بلکہ شائد اس سے بھی زیادہ نازک نوعیت ہماری فطرت اور طبیعت کے اندرونی رجحانات و میلانات کی ہے بالکل ممکن ہے کہ مذاق و مزاج میں دو آدمیوں میں اتحاد ہو، اتنا اتحاد ہو کہ ، ۹۹ فی صدی اشتراکی نقاط اس باب میں دونوں کے متحد ہوں لیکن یقین کیجئے کہ آخر میں کوئی نقطہ دونوں میں اختلاف کا بھی ہوگا تجربہ یہی بتاتا ہے یعنی پھل کو دیکھ کر درخت کے پہچاننے کا جو طریقہ ہے اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے اور درخت سے جو پھل کو پہچانتے ہیں، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ کائنات کے خالق نے گلاب کی ایک پنکھڑی بھی ایسی نہیں بنائی جو بعینہ دوسری پنکھڑی جیسی ہو تجلیات میں تکرار نہیں ہے "یہی صوفیوں کا بھی مکاشفہ ہے اور۔

لوح جہاں پر ہر حرف مکرر نہیں ہوں میں

ہمارے فلسفی شاعر کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

پس یہ خیال کہ سارے انسانی افراد میں ایسی وحدت اور یگانگی پیدا ہو سکتی ہے کہ ظاہراً و باطناً کسی قسم کا اختلاف ان میں باقی نہ رہے یہ قدرت سے، قدرت کے قانون سے جنگ کا ارادہ ہوگا۔

لیکن ان ہی غیر ارادی، قدرتی اختلافات کے اندر، ارادی اتحاد کے

رشتہ کو قائم کرنا "وحدت انسانی" کے نظریہ کا امکانی نصب العین اگر ہو سکتا ہے تو صرف یہی ہو سکتا ہے۔

اب آئیے اور دیکھئے کہ نصف ارب سے زیادہ تعداد والی برادری مسلمانوں میں جو اہل السنت والجماعت کے نام سے پائی جاتی ہے ان سنی مسلمانوں میں، اس میں شک نہیں، کہ بعض علاقوں کے مسلمان حنفی کہلاتے ہیں اور بعض کے شافعی، ان میں کچھ مالکی کے نام سے موسوم ہیں اور ان ہی میں بعضوں کو حنبلی بھی کہتے ہیں، بلاشبہ سنی مسلمانوں میں ان چار ناموں کے مسلمان باقی رہ گئے ہیں، اور یہ بھی صحیح ہے کہ صرف نام ہی کا یہ یہ اختلاف نہیں ہے بلکہ ان چاروں طبقات کے دینی کاموں میں بھی اختلافات پائے جاتے ہیں اور کافی اختلافات، لیکن سوال یہ ہے کہ ان اختلافات کی بنیاد پر سنی مسلمانوں کے ایک گروہ نے اپنے دین کو کیا دوسرے گروہ کے دین سے کبھی کسی زمانہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی جدا کیا یا جدا سمجھا ہے؟۔

خود ان بزرگوں کے باہمی تعلقات اور ان کے احترامی حسن سلوک سے جو ناواقف ہیں جو نہیں جانتے کہ امام شافعیؒ امام مالکؒ کے تلمیذ رشید تھے یا احمد بن حنبلؒ امام شافعی کی رکاب تھام کر بغداد کے بازاروں میں گھومتے تھے۔ امام شافعیؒ نے ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد بن حسن الشیبانی سے کتنا سیکھا اور کیا کیا سیکھا، امام ابو حنیفہؒ کے مرقد انور پر پہنچ کر امام شافعی نے کیا کیا تھا ان ناواقفوں کو کم از کم اس کا تو اندازہ کرنا چاہیئے کہ حنفی مسلمان جب امام شافعی کا ذکر کرتا ہے تو امام ہی کے لفظ سے ان کا ذکر

کرتا ہے امام مالک کا نام امام کے لفظ بغیر لے نہیں سکتا، امام احمد حنبل کی داستان صبر و ابتلاء کو سن کر حنفی مسلمان بھی اسی قدر آب دیدہ ہو جاتا ہے جتنا متاثر خود کوئی حنبلی مسلمان ہو سکتا ہے، اور یہی کیا کون نہیں جانتا کہ تمام حنفی مسلمانوں کے نزدیک خدا رسیدہ بزرگوں میں احترام کا جو مقام ایک حنبلی بزرگ کو حاصل ہے، یعنی غوث اعظم قطب الاقطاب حضرت شیخ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ وہ حنبلی تھے، یا حجۃ الاسلام غزالی فخر الاسلام رازی باوجود شافعی المذہب ہونے کے حنفیوں کے بھی مالکیوں کے بھی، حجۃ الاسلام اور فخر الاسلام ہیں، جلال الدین رومی حنفی ہونے کے باوجود سارے اسلامی طبقات میں میں مقبول ہیں، مجدد الف ثانی کو ہندوستان میں تو صرف حنفی مسلمان دین کا مجدد تسلیم کرتے ہیں، لیکن ہندوستان سے باہر نکل کر عراق میں، شام میں عرب میں لاکھوں، لاکھ کی تعداد میں شوافع مالکیہ حنابلہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ماننے والے آپ کو مل جائیں گے۔

سچ پوچھئے تو دینی اختلافات کا یہی رنگ مسلمانوں میں ایسا ہے جیسے نہ سیاسی عوامل و موثرات کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ باہر درآمد شدہ جراثیم سے اس کا تعلق ہے بلکہ صحیح معنوں میں اندرونی اسباب ہی پر اسکی بنیاد قائم ہے

کچھ روایات اور زیادہ تر اسلامی کلیات کے تفصیلی نتائج اور استنباطی مسائل کے اختلاف سے یہ صورت حال پیدا ہوئی ہے۔

الکتاب یعنی قرآنی مطالبات الصلوٰۃ الزکوٰۃ الصوم والحج وغیرہ وغیرہ کی تعمیلی شکلوں کو کر کر کے خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دکھایا تھا، ان کی

روایت کرنے والے بزرگوں کے علم و فہم کے اختلاف سے روایتوں میں تھوڑا بہت اختلاف پیدا ہوا ابتداء اسلام میں ان روایتوں کو جن لوگوں نے منقح کرنا چاہا اور اس کے ساتھ اسلامی کلیات سے جو نتائج حسب ضرورت نکلتے رہے، ان میں نتیجہ نکالنے والوں کے علم و فہم کے اختلافات سے یہی اختلاف کی ناگزیر صورتیں جو پیش آئیں۔ کلیتہً اندر کی ان ہی دو باتوں پہ بہر حال اس اختلاف کی بنیاد قائم ہے۔

یوں تو اس راہ میں کام کرنے والوں کی کافی تعداد اسلام کی ابتدائی صدیوں میں پائی جاتی تھی لیکن گھٹ گھٹا کر مٹ مٹا کر چار بزرگوں کے خدمات کو مختلف اسباب و وجوہ سے غیر معمولی حسن قبول حاصل ہوا کتابوں میں ان کے تنقیح شدہ نتائج مدون ہوئے امت میں ان ہی کتابوں کی اشاعت ہوئی اور ان ہی کے اسمائے گرامی کی طرف چاروں طریقوں میں سے ایک ایک طریقہ منسوب ہے امام ابو حنیفہؒ کے مکتب خیال کے ماننے والے حنفی محمد بن ادریس شافعیؒ کے ماننے والے شافعی، امام مالکؒ بن انس کے ماننے والے مالکی، احمد بن حنبلؒ کے ماننے والے حنبلی کے نام سے موسوم ہوئے۔

یہ ہے خلاصہ سنی مسلمانوں کے اندرونی اختلافات کے قصوں کا۔

اور یہ تو خیر ما میانہ اشارے ہیں۔ واقعات سے جو نا واقف ہیں ان کو صرف چونکانا مقصود ہے، اپنے معلومات کا وہ خود جائزہ لیں اور سمجھیں کہ ان بزرگوں کے ماننے والے مسلمانوں کے اختلاف کی واقعی نوعیت کیا ہے۔

حد تو یہ ہے کہ "تعلیم و تعلم" اور وہ بھی دین کی تعلیم و تعلم، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر "دینی تربیت" کے سلسلہ میں پیری و مریدی کے تعلقات میں بھی مسلمانوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ جس سے ہم دینی علوم کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں یا دینی تربیت کے لئے مریدی کا رشتہ قائم کر رہے ہیں۔ وہ حنفی ہے یا شافعی، مالکی ہے یا حنبلی، بس جس کے پاس دین کا علم پایا گیا اور جس کی صحبت میں دیکھا گیا کہ لوگ دین دار بن جاتے ہیں ان سے علم بھی مسلمان ہمیشہ حاصل کرتے رہے اور دینی تربیت بھی ان سے پاتے رہے۔ اول سے آخر تک مسلمانوں کی یہی تاریخ رہی ہے۔

یہی کیا، جاننے والے جانتے ہیں کہ اندرونی اختلافات کے ان قصوں میں بسا اوقات یہ صورت بھی پیش آئی ہے کہ کسی امام کے نقطۂ نظر سے وضو ٹوٹ جاتا ہے لیکن دوسرے امام کے نزدیک نہیں ٹوٹتا، مثلاً بدن سے خون نکلے یا نکسیر پھوٹی پچھنا لگایا گیا۔ بایں ہمہ اوّل سے آخر تک ہر طبقہ کے مسلمان دوسرے طبقہ کے امام کے پیچھے نماز پڑھتے چلے آئے ہیں ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں نقل کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل جو قائل تھے کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، بغیر تازہ وضوء کے نمازی کی نماز درست نہ ہوگی، باوجود اس کے ان سے کسی نے پوچھا کہ ایسا آدمی جس کے بدن سے خون نکلا اور وضوء کئے بغیر نماز پڑھ رہا ہو تو ہم اس کے پیچھے کیا نماز پڑھ سکتے ہیں غضب ناک ہو کر پوچھنے والے سے امام احمد نے فرمایا کہ،

کیف لا اصلی خلف سعید بن المسیب — یعنی سعید بن المسیب کے پیچھے نماز کیسے نہ پڑھوں گا۔

مطلب آپ کا یہ تھا کہ خون نکلنے سے وضوء نہیں ٹوٹتا یہی فتویٰ سعید بن المسیب کا تھا۔ ساری امّت میں صحابہؓ کے بعد ان ہی کو بعضوں نے افضل التابعین قرار دیا ہے پھر کیا ان کے پیچھے نماز درست نہ ہوگی حاصل یہ ہے کہ گو خود امام کی تحقیق یہی تھی کہ خون نکلنے سے وضوء ساقط ہو جاتا ہے لیکن بایں ہمہ جو کہتے تھے کہ نہیں ٹوٹتا ان کو بھی برسر غلطی نہیں سمجھتے تھے بلکہ خیال یہی تھا کہ تحقیق سے وہ اسی نتیجہ تک پہنچے ہوں گے لیکن دین تو ہم سب کا ایک ہی ہے اور یہی دستور مسلمانوں میں شروع سے چلا آ رہا تھا شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اسی موقعہ پر یہ بھی لکھا ہے کہ۔

"سارے صحابہ اور تابعین (صحابہ کے شاگرد تربیت یافتہ حضرات) اور ان کے بعد بھی بزرگوں میں دیکھا جاتا ہے کہ کوئی بسم اللہ کو نماز میں پڑھتا ہے کوئی نہیں پڑھتا۔ —— کوئی فجر میں قنوت کی دعا پڑھتا ہے۔ کوئی نہیں پڑھتا کوئی پچھنا لگا لے اور نکسیر پھوٹنے سے وضوء کے ٹوٹ جانے کا قائل ہے کوئی نہیں" اس قسم کے بیسیوں اختلافی مسائل کا ذکر کر کے لکھا ہے۔

مع هذا کان یصلی بعضهم خلف بعض (ص ۱۳۸ ج ۲) — باوجود اس کے ان میں ہر ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھا کرتا تھا۔

ان تاریخی شواہد کی تفصیل کے لئے چاہیئے کہ میرا مقالہ "تدوین فقہ" کا مطالعہ کیا جائے جس سے آپ کو معلوم ہو گا کہ خود امام مالک نے ایک سے زیادہ دفعہ عباسی حکومت کے خلفاء کو اس ارادہ سے روکا کہ امام مالک ہی کے فقہی نتائج کا سارے مسلمانوں

کو بزور حکومت پابند بنایا جائے۔ بلکہ اسکے مقابلہ میں امام نے مطالبہ کیا کہ جس علاقہ کے مسلمانوں میں جن علماء کے فقہی نتائج پھیل چکے ہیں ان کو خواہ مخواہ ان سے ہٹایا نہ جائے کیونکہ وہ بھی دین ہی کی ایک شکل ہے بلاوجہ لوگوں میں وحشت و نفرت کے جذبات کیوں ابھارے جائیں۔ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیزؒ نے بھی گشتی فرمان جاری کیا تھا کہ جس علاقہ میں لوگ جن ائمہ کے اقوال پر عمل کر رہے ہیں۔ انکو اسی حال پر چھوڑ دیا جائے ان ہی عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک فرمان کا ترجمہ یہ ہے۔

"ان اختلافات کی وجہ سے دین میں بڑی وسعت پیدا ہوگئی ہیں دین کی راہ میں اس کو تمام قیمتی چیزوں میں بڑی غیر معمولی چیز سمجھتا ہوں وہ بڑی ناپسندیدہ حالت ہوتی کہ اس قسم کے مسائل میں لوگ کسی ایک ہی پہلو پر سمٹ جاتے۔"[1]

مشہور محدث و فقیہ سفیان ثوری توان لوگوں کو ٹوک دیا کرتے تھے جو ائمہ اجتہاد کے ان فقہی اختلافات کو اختلافات کے نام سے موسوم کرتے اور ہدایت کیا کرتے بھائی! یوں کہا کرو کہ علماء نے مسلمانوں کے لئے یہ گنجائش اور فراخی دین میں پیدا کی (میزان الکبریٰ شعرانی ص۲۱)۔

اور یہ خیال کچھ اگلے بزرگوں ہی کا نہ تھا۔ بارہویں صدی ہجری میں فقہاء کی آخری کتاب حنفی فقہ کی جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں۔ شامی ہے اس کتاب کے شروع میں بھی فقہی اختلافات کے متعلق یہی نقطہ نظر اختیار کیا گیا ہے کہ

[1] مسند دارمی میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے فرمان کا یہ فقرہ مل جائے گا کہ لیقضی کل قوم بما اجتمع علیہ فقہائھم جن لوگوں نے پچھلے دنوں ہندوستان میں اس مشورے کی خلاف ورزی کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں میں فتنے برپا کئے انکو چاہیئے کہ دارمی مطبوعہ ہند کے ص۸۰ میں اس قول کو پڑھیں۔

مشکلات میں مسلمانوں کے لئے ان ہی اختلافات کی بنیاد پر آسانی کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ استدلال میں فتاویٰ تاتارخانیہ سے جو ہندوستان میں تاتارخان تغلقیوں کے وزیر کے حکم سے مدون کیا گیا تھا۔

اس کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ

فان فی اختلاف ائمۃ الھدیٰ توسعۃ للناس ص۶۳ — ائمہ ہدیٰ (یعنی اہل السنت کے ائمہ مجتہدین) کے اختلافات سے درحقیقت لوگوں کیلئے گنجائش پیدا ہوتی ہے۔

حالانکہ پچھلے زمانہ کے فقہاء سخت گیری اور تشدد میں عموماً بدنام ہیں۔ لیکن شامی تک میں جب فخر الائمہ صاحب معراج الدرایہ کے اس قول کو نقل کر کے سراہا ہے کہ۔

"فقہا کے مختلف اقوال میں سے کسی قول پر مسلمانوں کی آسانی کے لئے ضرورۃً فتویٰ دیا جائے تو یہ اچھی بات ہوگی۔ (ص۶۹ شامی ج۱)

مطلب یہی ہے کہ بظاہر وہ قول ضعیف اور مرجوح ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن دشواری میں کوئی مسلمان اگر مبتلا ہوگیا ہو تو ایسے مواقع پر ضعیف اور مرجوح اقوال کی پشت پناہی میں اس مصیبت زدہ کی امداد علماء کے لئے باعث ثواب ہوگا۔

بہرحال تفصیلات کے لئے مطولات اور بڑی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیئے خصوصاً علامہ عبدالوہاب شعرانی کی کتاب میزان الکبریٰ کا مطالعہ ان لوگوں کے لئے مفید ہوگا جو ان ہی فقہی اختلافات کا تذکرہ کر کے دین سے دلوں میں بیزاری پیدا کرنا چاہتے ہیں میرا مقالہ جو عثمانیہ یونیورسٹی کے ریسرچ جرنل یعنی مجلہ تحقیقات علمیہ میں شائع ہو چکا ہے مل جائے تو اس کو بھی پڑھئے آپ کو

پتہ چلے گا۔ کہ اس قسم کے اختلافات میں مسلمانوں کے ارباب تحقیق کا فیصلہ یہ ہے کہ ان میں جو بھی اپنے اجتہاد اور کوشش سے جس نتیجہ تک پہنچا ہر نتیجہ درست اور صحیح ہے شاہ ولی اللہ علیہ نے عقد الجید میں لکھا ہے کہ۔

"امام ابوالحسن اشعری، قاضی ابوبکر باقلانی اور ان سے پہلے قاضی ابویوسف اور محمد بن حسن ابن شریح اس خیال کو ظاہر کر چکے ہیں۔ یعنی ہر پہلوان اختلافی مسائل کا صحیح اور درست ہے"

شاہ صاحب نے آخر میں لکھا ہے کہ۔

جمہور متکلمین اشاعرہ اور معتزلہ دونوں ہی کی طرف یہی خیال کتابوں میں منسوب کیا گیا ہے" (عقد الجید ص۱۱)۔

مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ ان اختلافات کی مثال ایسی ہے جیسے حدیثوں میں آیا ہے کہ

اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ — قرآن سات (یعنی بہت سے) حروف پر نازل ہوا ہے

آخر ہم قرآنی الفاظ کی قراءتوں کی مختلف شکلوں کو جیسے صحیح سمجھتے ہیں اجتہادی مسائل کے اختلافات کے ہر پہلو کو صحیح قرار دینے میں کیا دشواری پیش آئے گی۔

بہر حال سلف سے خلف تک کتابوں میں بھی لوگ لکھتے چلے آئے ہیں اور اول سے آخر تک مسلمانوں کی فہم عمومی کا عملی مذاق بھی یہی رہا ہے تقلید تو کوئی تنہا نہیں لگر کسی ایک امام کی ہی کرتے رہے ہیں لیکن احترامی تعلقات اجتہاد و تفقہ کے سارے آئمہ کیساتھ انہوں نے مسلسل باقی رکھے ہیں سب ہی کو مقبولان خدا اور دین کے راست باز پیغمبر کے وفادار بزرگوں میں شمار کرتے رہے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ اس کا اعتراف بھی واقعہ کا اعتراف ہوگا کہ خاص حالات کے زیر اثر کبھی کبھی تاریخ کے طویل دور میں مسلمانوں پر ایسے خفقانی دورے ہوتے رہے جن میں دیکھا گیا ہے کہ روح سے بے تعلق ہو کر سبک دماغوں کا کوئی طبقہ گروہ دین کے صرف بیرونی خط و خال نوک پلک کے سنوارنے پر بے جا اصرار کر رہا ہے غلو میں بڑھتے ہوئے اس سلسلہ میں اس حد تک پہنچ گیا کہ عام مسلمانوں کیلئے اس گروہ کا وجود باعث فتنہ و فساد افتراق و شقاق بن گیا۔ نہ جاننے والے عموماً اس کی ذمہ داری فقہی اختلافات کے قصوں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

حالانکہ سچ پوچھئے تو ہر آبادی میں کچھ لوگ ایک خاص قسم کے نفسیاتی مرض اور ذہنی روگ کے شکار ہوتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ قدرت حق سے کہیں کسی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں مثلاً کامیاب ہو گئے تو انکی زندگی سمٹ سمٹا کر اسی ملازمت اور ملازمت کے قصوں میں کھپ جاتی ہے سرکاری ملازم کے جو فرائض ہیں کہ وقت پر کچہری میں آدمی حاضر ہو، خدمت جو اس کے سپرد کی گئی ہے دیانت و امانت کے ساتھ اس کے حقوق ادا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ کچہریوں کا ملازم صرف کچہریوں کا ملازم ہی نہیں ہوتا وہ اپنے بچوں کا باپ بھی ہے بیوی کا شوہر بھی ہے، عزیزوں اور قریبوں کا رشتہ دار بھی ہے سوسائٹی کا ایک فرد بھی ہے الغرض کچہری کی زندگی کے سوا اور بھی بیسوں شعبوں سے اسکا تعلق ہے، لیکن مذکورہ بالا نفسیاتی روگ کے بیماروں کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ان کی ملازمت دفتر کی کرسی اور میز تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اپنی بیوی بچوں میں بھی سرکاری ملازمت کا شعور ان کا گلا پکڑے رہتا ہے ملنے جلنے والوں کے سامنے بھی وہ سرکاری ملازم کے سوا

اور کسی شعور کو اپنے اندر نہیں پاتے۔ جاگتے بھی ہیں تو اسی تصور کے ساتھ کہ حکومت کا میں عہدہ دار ہوں اور سوتے بھی ہیں تو اسی خیال کے ساتھ سوتے ہیں الغرض زندگی کا کوئی لمحہ اس احساس سے ان غریبوں کا خالی نہیں ہوتا۔ اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لوگ درحقیقت اپنی ملازمت کے حقیقی فرائض کی تکمیل سے قاصر ہوتے ہیں آخر دفتر کے باہر بھی جو سرکاری ملازم ہی بنا رہے گا تو دفتر کے اندر پہنچ کر نئے فرائض کا شعور اس میں نہ ابھرے اور اندر پہنچ کر بھی وہ باہر رہے تو اس قسم کی ذہنیت کا انجام عام حالات میں یہی ہونا چاہیئے۔

ایک نفسیاتی روگ

مذکورہ بالا نفسیاتی مرض کے مریضوں میں سے کسی کا ذہنی رشتہ کسی وجہ سے مذہب یا دین کے ساتھ جب قائم ہو جاتا ہے اس کے تماشے بھی عجیب ہوتے ہیں اچانک اپنے ہم مذہب افراد کی عمومیت سے دیکھا جاتا ہے کہ اچک کر باہر ہو گیا جو کچھ سب مانتے ہیں وہی وہ بھی مانتا ہے، جو کچھ سب جانتے ہیں وہی سب کچھ وہ بھی جانتا ہے لیکن اس نفسیاتی بحران کے زمانہ میں چشم و ابرو کے ہر اشارہ سے یہی ظاہر کرتا ہے کہ دین اور دینیات کے سوا نہ اس کے اندر کچھ باقی رہا ہے اور نہ باہر حرکت ہو یا سکون، نشست ہو یا برخواست، ہر حال میں ایسا معلوم ہوتا ہے اور شاید دوسروں کو وہ یہی معلوم بھی کرانا چاہتا ہے کہ براہ راست خدا سے اسی کا تعلق قائم ہے مذہب کے واحد جاگیردار اور دین کے تنہا ٹھیکہ دار کی شکل میں اپنے آپ کو وہ نمایاں کرتا ہے اور یوں اپنے متعلق طرح طرح کی

خوش فہمیوں میں غلط اور بیچاں رہتا ہے۔

شاید اسی قسم کے نفوس اور ان کے نفسیاتی مرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت ابوسعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے تاریخ دمشق میں ابن عساکر نے ان ہی کے حوالہ سے یہ قول ان کا نقل کیا ہے۔

اقوام یظهر علیهم سرعة الا	کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کو دیکھا جاتا ہے کہ عالم میں جو
نتساب الی اللہ تعالیٰ عند الحوادث	حوادث پیدا ہوتے ہیں یا احکام الٰہی جاری ہوتے ہیں ان کو
و نزول الاحکام فقال ابعد	خدا کی طرف منسوب کرنے میں سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتے
الناس من اللہ من یدعی	ابوسعید نے ان کا ذکر کر کے کہا، جو خدا کی طرف اشارہ کا اور خدا
الاشارة والقرب واکثرهم	سے نزدیک ہونے کا مدعی ہو وہ سب سے زیادہ خدا سے دور ہے
الیه اشارة مقتهم منه	خدا کے غضب کا سب سے بڑا نشان وہی ہے جو سب سے زیادہ
(ص ۲۲۹ ج ۱۵)	(ہر بات میں) اسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا دکھائی دے۔

شاید اسی ممقوت و مبغوض طبقہ کے انجام کو دیکھ کر مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ

"تم مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو نگلتے ہو"

ہندوستان میں بھی پچھلے دنوں زوالِ حکومت کے بعد مسلمانوں پر آفات و مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ان قصوں میں اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کی بعض ناگوار صورتیں اس شکل میں جو پیش آئیں کہ مسجدوں میں دنگے ہو رہے ہیں، جوتے چل رہے ہیں، گتھم گتھی ہو رہی ہے ایک دوسرے کو معمولی معمولی باتوں پر مسجدوں سے نکال لینے پر اصرار کر رہا ہے، بسا اوقات بے غیرت مسلمانوں کو اپنے دینی مسائل کے جھگڑوں میں انگریزی حکام کے سامنے

فیصلہ طلب کرنے کیلئے حاضر ہونا پڑا، دین اسلامی کے اختلافی مسائل کے استعمال کی یہ ایک بدترین شکل تھی جو دین کے متعلق اسی قسم کے نازک احساسات والوں کے غلط طریقۂ عمل کی پیداوار تھی۔

اسلام کی روح اور دین کے مغز سے بے گانہ ہوکر صرف اسی پر لڑ رہے تھے کہ گو آہستہ آمین کہنا بھی حدیثوں سے ثابت ہے لیکن زیادہ قوی حدیثوں سے ان کا دعویٰ تھا کہ زور سے آمین کی آواز کا منہ سے نکالنا یہی بہتر ہے یا بجائے ناف یا زیر ناف کے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا خیال کرتے تھے کہ زیادہ اچھا ہے رکوع میں جاتے ہوئے یا اس سے اٹھتے ہوئے کوئی۔ دونوں ہاتھوں کو نہ اٹھائے تو وہ بھی کہتے تھے کہ اس کی نماز ہوگئی تاہم اٹھانا ہاتھوں کا کہتے تھے کہ زیادہ ثواب کا کام ہے یہ سب کچھ ماننے کے باوجود ان ہی چند مسئلوں میں جو غل غپاڑے ہوتے ہنگامے مچائے گئے جگ ہنسائیاں ہوئیں وہ بڑی دردناک داستان ہے فقہی اختلاف کے غلط استعمال کی یہ بڑی ہولناک تاریخی مثال ہے۔

اور گو اب یہ جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑتا چلا جارہا ہے، لیکن دین کے صحیح احساس کا نتیجہ شاید ہم اسکو بھی قرار نہیں دے سکتے وہ تو جو کچھ ہو رہا تھا دینی احساس کی شدت کا نتیجہ تھا اور اب جو کچھ دیکھا جارہا ہے دینی احساس سے بے گانگی کی یہ پیداوار ہے، جیسے جیسے مغربی تمدن کا اثر جاگزیں ہوتا جارہا ہے دین کے فروعی مسائل تو خیر دور کی چیزیں ہیں خود اصل دین ہی سے لوگ بے تعلق ہوتے چلے جارہے ہیں خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا آخری انجام کیا ہوگا زوالِ حکومت کی چوٹ سے کچھ چونک پیدا بھی ہوئی تو اس چونک اور تنبیہ کا رخ ہ اختلافی مسائل کی طرف پھر گیا ادھر سے

رخ کچھ مڑا بھی ہے تو خطرہ پیدا ہوگیا ہے کہ اصل دین ہی کا قصہ العیاذ باللہ ختم نہ ہو جائے۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں زوالِ حکومت کے بعد ذہنی اختلال اور اسکے نتائج

بہرحال یہ کہنا چاہتا تھا کہ بجائے خود اندرونی اختلافات کے ان قصوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، البتہ کبھی کبھی مغزوں کے اسی طبقہ نے ان کو بھیانک اور حد سے زیادہ خوفناک بنا دیا جیساکہ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں زوال حکومت سے پیدا ہونے والی بے چینیوں کے سلسلہ میں دیکھا گیا تھا، لوگ حیران تھے کہ اچانک یہ ہوا کیا۔ جو حاکم تھے وہ محکوم بن گئے جن کا سب کچھ تھا ان کا کچھ باقی نہ رہا، پھر کچھ تو مذہب کے ان ہی فروعی مسائل کے سلجھانے میں مشغول ہوئے شاید ان کا احساس تھا کہ ان مسائل سے غفلت کی سزا مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے دی گئی ہے لیکن سلجھانے کی ہر کوشش مسائل کو الجھاتی ہی چلی گئی بعضوں نے فقہ کے ساتھ ساتھ حدیثوں کے قصہ کو بھی اسی لئے ختم کر دینے کا تہیہ کیا اور دعوت دینے لگے کہ عتاب الٰہی کے ازالہ کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی کتاب پر مسلمانوں کو جمع کر دیا جائے مگر عمل کا جب وقت آیا تو جو ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ جمع کرنیوالوں کا یہ طبقہ مسلمانوں کو اپنے اوپر ہی جمع کرنے لگا قرآن کے ساتھ ضروری قرار دیا گیا کہ قرآن سمجھانے والوں کے دماغوں اور بھیجوں پر بھی ایمان لایا جائے۔

اسی سلسلہ میں بعضوں نے تو قرآن کے ساتھ ساتھ خود اپنے اوپر ہونیوالی وحیوں پر بھی ایمان لانے کی دعوت حکومت سے محروم ہونے والے مسلمانوں کو دینا شروع

گیا۔ کھوئی ہوئی حکومت کے ملنے کی واحد شکل یہی قرار دی گئی کہ محمد رسول اللہ کی وحی کے ساتھ جدید وحی کی روشنی حاصل کی جائے۔ گویا محمدی رسالت ناکافی ٹھہرائی گئی اور قرآن وحی جو آسمان سے اترنے والی وحیوں میں قرآن ہی کی رو سے آخری وحی ہے اسکے بعد بھی نئی اور جدید وحی کے نزول کا ادعا بے شرمی سے کیا گیا باندھنے والوں نے خدا پہ جھوٹ باندھا۔ بہرحال یہی خفقانی دورے تھے جو مختلف شکلوں میں دلوں اور دماغوں پہ مختلف شکلوں میں پڑتے رہے اور یہ سب جو کچھ بھی ہوا زیادہ تر ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا، جو عام مسلمانوں کے مقابلہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی اختصاصی رشتہ کے مدعی بن بیٹھے تھے دین کی بے بنیاد جاگیرداری اور مذہب کی غلط اجارہ داری کے دھوکہ میں وہ مبتلا ہو گئے اگرچہ اسی کے ساتھ تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے کہ قصداً و ارادۃً فروعی اختلافات کے ان قصوں کو چھیڑ کر کبھی کبھی ناواقف غریب مسلمانوں کے اندر اپنا الو سیدھا کرنے کی نکو ہیدہ کوششیں بھی کی گئیں، بات بتنگڑ بنی، تل بڑھا کر مسہ بنا دیا گیا جو کچھ نہ تھا قرار دیا گیا کہ وہی سب کچھ ہے۔

یوں ائمۂ اجتہاد کے ماننے والوں کو ٹکریوں میں بانٹ بانٹ کر اپنی شکم پروری کا سامان بھی مانا چاہیئے کہ بعض سیاہ سینہ افراد نے کیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا کہ افتراقی کی جو شکلیں مسلمانوں کے اندر زوال حکومت کے بعد پیدا ہوئیں ان میں بھی شکمی کاروبار والوں کا ہاتھ تھا یا نہیں، بلکہ عرض کر چکا ہوں میرا خیال یہی ہے کہ زیادہ تر اس نفسیاتی روگ کی پیداوار ہے جس کا بدقسمتی سے اس زمانہ میں دین ہی سے تعلق قائم ہو گیا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس جھمیلے میں شکمی

عیارانِ شاطر بھی شریک ہو گئے ہوں۔

بہرحال ہندوستان میں دینی جھگڑوں کے یہ تماشے جو دیکھے گئے دین کے صحیح احساس پر اس کی بنیاد یقیناً قائم نہ تھی۔ اب خواہ تہ میں ان کے وہی نفسیاتی مرض ہو یا شکمی تقاضے پوشیدہ ہوں۔ تاہم یہ بھی قطعاً بہتان اور افترا ہے کہ بانٹنے والوں نے مسلمانوں کو کلیتہً فقط اپنے پیٹ میں کچھ ڈالنے کیلئے ہی بانٹا تھا بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ اکثریت اس جرم سے اپنا حسنِ ظن تو یہی ہے کہ عموماً بری اور پاک تھی۔

شکم پروری کے لئے دینی جھگڑوں کی پیدائش

لیکن پیٹ کے لئے ناواقف مسلمانوں کو کبھی بانٹا نہیں گیا ہے۔ یہ بھی کلیتہً درست نہیں ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے فہیم وذکی۔ عالم بیدار مغز سیاح علامہ مقدسی ہیں، انہوں نے سیاحت کے بعد سفر کی یادداشتوں کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب بھی کر دیا تھا۔ کتاب یورپ میں طبع ہو کر شائع بھی ہو چکی ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سارے اسلامی ممالک جن میں مقدسی گھومے ہیں وہاں کے مسلمانوں کے دینی رجحانات کا ہی تذکرہ کرتے چلے گئے ہیں خراسان میں جب پہنچے تو لکھا ہے کہ

”حنفی مسلمانوں کو دیکھا کہ ان کو لوگ یہاں سمکیہؒ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور شافعیوں نے اپنے آپ کو صدقیہ کے نام سے مشہور کیا ہے“۔

آگے ان ہی کا بیان ہے کہ:۔

بینهما عصبیات یهراق فیها — (حنفیوں اور شافعیوں میں) لاگ ڈانٹ کے تعلقات

الدماء ویدخل بینهما — قائم ہیں اور بسا اوقات اسی سلسلہ میں خون ریزیاں بھی ہوتی ہیں

السلطان ص ۳۴۶ • حکومت کو دخل اندازی کی ضرورت ہوتی ہے۔

خراسان کے شہر سرخس میں پہنچے تو پایا کہ حنفیوں کو یہاں عردسیہ کہتے ہیں اور شافعیہ اپنے آپ کو اہلیہ کہتے ہیں آئے دن ان میں مذہبی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں ہرات میں بھی تماشہ انہوں نے دیکھا حد یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں بھی مقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے دیکھا کہ :۔

"وہاں کے جزارین (قصابوں) اور خیاطین (درزیوں) میں خوب جھگڑے ہوتے ہیں۔ قصابوں کی پارٹی سنی بن کر لڑتی تھی اور درزی شیعہ بن کر ان پر چڑھائی کرتے تھے۔ صـ۱۰۲"

عرب ہی کے مقام یمامہ میں پہنچے، تو لکھا ہے کہ :۔

"وہاں دیکھا کہ قصابوں کی ٹولی الگ ہے اور بدووں سے انکی لاگ ڈانٹ چلی جاتی ہے (دینی جھگڑے بڑھتے ہوئے اس نوبت کو پہنچ چکے ہیں کہ جامع مسجد تک کا ان لوگوں نے بٹوارہ کر لیا ہے۔ جب کوئی مسافر باہر سے ان کے یہاں آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ان دونوں فرقوں میں سے جس کے پاس تمہارا جی چاہے ٹھہر سکتے ہو ورنہ پھر یہاں سے نکل جاؤ" صـ۱۰۴۔

بصرہ میں بھی بیان کیا ہے کہ

"شہریوں کو بھی ان ہی مذہبی قصوں کے سلسلہ میں لوگوں نے بانٹ رکھا ہے، آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور اطراف نواح کے قصبوں، دیہاتیوں سے بھی لوگ ہر ایک کی مدد کیلئے آتے ہیں"

کتاب تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے لیکن یاد آتا ہے کہ معجم البلدان میں

"رے" جس کے کھنڈروں کے پاس آجکل طہران کا شہر آباد ہو گیا ہے اسی "رے" کے ذیل میں لکھا ہے کہ۔

"حنفیوں اور شافعیوں کو اس شہر میں لڑایا گیا اور اتنا لڑایا گیا کہ برابر دیہاتیوں اور قصبوں سے اپنی اپنی پارٹی کی حمایت کے لئے بھرے آتے رہتے تھے اتنی خونریزیاں ہوئیں کہ بالآخر "رے" کا اکثر حصہ ویران و برباد ہو کر رہ گیا"

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے فروعی اختلافات سے ناجائز اور قطعاً ناجائز اٹھانے کی یہ ناپاک کوششیں تھیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں قصابوں، درزیوں، بدووں یا اسی قسم کے بے چارے عامیوں، ناواقفوں کو بے وقوف بنا کر کام نکالنے والے اس زمانے میں بھی کام نکالتے تھے اور آج بھی اس راہ میں کامیابی کیلئے عوام کے ان ہی طبقات کو تاکا جاتا ہے ورنہ جہاں کے مسلمان پڑھے لکھے، صاحب فہم و بصیرت تھے ان ہی مؤرخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی وہاں نہیں چلتی تھی۔ مقدسی کی کتاب میں انکی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ قیروان جو کسی زمانہ میں افریقہ کا سب سے بڑا مرکزی شہر لاکھوں لاکھ کی آبادی والا تھا۔ مقدسی نے وہاں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس شہر میں حنفی بھی ہیں اور مالکی بھی جن میں کسی قسم کی کوئی کش مکش اور جھگڑے نہیں ہیں سب مل جل کر محبت و الفت کی زندگی بسر کرتے ہیں" صـ۲۲۵۔

جس سے معلوم ہوا کہ "مذہبی اختلافات" میں بجائے خود فتنہ و فساد شقاق و نفاق کے جراثیم پوشیدہ نہیں ہیں بلکہ بھرنے والوں کا جب جی چاہتا ہے یا ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان میں بھی باہر سے زہر بھر دیتے ہیں اسی جہاں گرد جہاں بین سیاح نے

نے ایک موقعہ پر بڑی دلچسپ تجربہ کی عبرت آموز خبر دی ہے۔ بلخ کے متعلق یہ لکھ کر کہ:۔
"اس شہر کو مذہبی جھگڑوں سے دیکھا کہ پاک ہے۔"
آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ:۔

وبلخ عصبیات غیر المذاہب	لیکن بجائے مذہب کے، وہاں غیر مذہبی تعصبات
وکذلک فی جمیع البلدان	کا زور ہے اور اسی طرح تمام شہروں میں کسی نہ کسی قسم کا
عصبیات ص ۳۳۶	تعصب پایا ہی جاتا ہے۔

یہ بڑے پتہ کی بات ہے اور یہی واقعہ ہے عرض کر چکا ہوں کہ بنی نوع انسانی کے افراد میں وحدت کے ساتھ کثرت اور اختلافات کے پہلوؤں کا پایا جانا ایک ناگزیر قدرتی واقعہ ہے لیکن اختلاف کے ان پہلوؤں کے استعمال میں آپ کو اختیار ہے چاہے فتنہ و فساد کے بھڑکانے میں ان کو استعمال کیجئے، چاہے گلہائے رنگ رنگ کو زینت چمن قرار دے کر ان سے منافع حاصل کیجئے۔

دینی قوموں کے خصوصی اوطان

سادہ دلوں کا ایک گروہ باور کئے ہوئے ہے کہ سارے جھگڑے مذہبی، اختلافات ہی سے پیدا ہوتے ہیں جن کے ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی یا تو دنیا کو مذہب اور دین کے عنصر سے کلیتہً خالی کر دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو سکے تو دنیا کو جنت بنانے کی ایک شکل احمقوں نے یہ تجویز کی ہے کہ زمین کے ہر حصہ کو کسی خاص دینی فرقہ کا وطن بنا دیا جائے جب یہ ہو جائے گا تو شاید خود بھی یہی باور کئے ہوئے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کراتے پھرتے ہیں کہ آئے دن کے جھگڑوں رگڑوں سے ہمیشہ کے لئے فرصت ہو جائے گی۔

احمقوں کی جنت

"احمقوں کی جنت"... صحیح معنوں میں اگر مالیخولیا کی کوئی شکل ہو سکتی ہے تو شاید یہی تجویز ہو سکتی ہے آپ دیکھ چکے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کو بھی جب بآسانی مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیا جا سکتا ہے، اور ایک فرقہ کو لے کر دوسرے فرقہ کے سروں پر پٹکنے والے بہ سہولت تمام پٹک سکتے ہیں تو آخر "ایک مذہب" کی صحیح تعریف کیا کی جاتی ہے، جب حنفیوں کو شافعیوں سے لڑایا جا سکتا ہے ایک کا خون دوسرے کے ہاتھوں بہانے میں بھی کامیابی حاصل کرنیوالے کامیابی حاصل کر چکے ہیں تو آخر "دینی وحدت" کا ایسا قالب کون بنا سکتا ہے جس میں قطعاً کسی اختلاف کی سرے سے گنجائش باقی نہ رہے۔

پھر جو مذہب کو ختم کر کے انسانوں کے باہمی اختلافات کے قصوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں مقدسی نے تو کئی سو سال پہلے دیکھا تھا کہ جہاں مذہبی تعصبات نہ تھے وہاں غیر مذہبی عصبیتوں کی بنیاد پر لوگ آپس میں الجھے ہوئے تھے "لیکن ہم تو اپنی آنکھوں سے آج دیکھ رہے ہیں، ہماری صدی ہی اسی تماشے میں گزر رہی ہے کہ ایک ہی دین ایک نبی ایک کتاب کے ماننے والے بلکہ ایک ہی رنگ تقریباً ایک ہی نسل والے ٹھہر ٹھہر کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے میں لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں مقتولوں کی فہرستیں مسلسل بنتی چلی جا رہی ہیں۔ تقسیم کیلئے معمولی معمولی حیلے تراش لئے جاتے ہیں آخر جب کالے رنگ کے چہرے والوں کو اجلی کھال والوں سے رنگ کے اخلاقی پہلو کو ابھار کر ٹکرا دیا جاتا ہے تو کسی زمانہ میں پستہ قد والوں کی ایک صف بنا کر دراز قد والوں سے یا چھوٹے کان والوں کو بڑے کان والوں سے بھڑا دینے کو آپ عجیب بات کیوں سمجھتے ہیں، زمین کے فرضی و وہمی حدود کو وطن کا نام دے کر جب عوام کو کٹوایا جا رہا ہے تو اس

قصے کو گھروں اور ملنگوں تک کیوں نہیں بڑھا جا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یوں مذہب اور دین سے کسی کا دل بے زار ہو تو خیر یہ دوسری چیز ہے لیکن لڑائی جھگڑوں کا الزام مذہب کے سر منڈھنا کہ سارے رگڑے جھگڑے مذہب ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور اسی بے سروپا الزام کی تہمت جوڑ کر سرے سے مذہب ہی کے ختم کر دینے کا وسوسہ جن دلوں میں پیدا ہو رہا ہے ان کو بجائے بہنے کے ٹھٹک کر ذرا واقعات پر نظر رکھتے ہوئے رائے قائم کرنی چاہئے۔ دوسروں سے تو کچھ کہنے کا مجھے حق نہیں لیکن مسلمانوں سے کہہ سکتا ہوں کہ کم از کم ان کے منہ سے تو مذہبی اختلافات کی نوحہ خوانیاں قطعاً بھلی نہیں معلوم ہوتیں۔ مقدسی نے اپنی اسی کتاب میں مذہبی اختلافات کے قصوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کوذ کے ایک پرانے بزرگ عمر بن مرہ کا ایک بڑا پر مغز بیان درج کیا ہے' خلاصہ جس کا یہ ہے کہ ایک شخص عمرو بن مرہ کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگا کہ جناب والا میرا عجیب حال ہے اب تک مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں شریک ہو ہو کر الگ ہوتا رہا ہوں ہر فریق اپنی تائید میں قرآن ہی سناتا ہے میں تو ان مذہبی جھگڑوں سے تنگ آگیا ہوں بتائیے کہ آخر میں کروں کیا؟ عمرو بن مرہ نے کہا کہ اے شخص سن تو نے مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کا ذکر کیا میں پوچھتا ہوں تو جواب دیتا جا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں اور جو کچھ اللہ کے پاس سے لائے سب سچ ہے کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ جواب دیا گیا نہیں۔

قرآن خدا کی کتاب ہے کیا مسلمانوں کا اسمیں اختلاف ہے؟ نہیں پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں کیا رمضان کے مہینے میں روزے فرض ہیں اس میں اختلاف ہے؟ نہیں بیت اللہ کا حج مسلمانوں پر فرض ہے کیا اسمیں اختلاف ہے:

نہیں۔ زکوٰۃ فرض ہے اسمیں اختلاف ہے؟ نہیں۔

جنابت (ناپاکی) سے پاک ہونے کیلئے غسل کرنا فرض ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟

نہیں۔ الغرض ابن مرہ مسلسل یوں ہی سوال کرتے جاتے تھے اور جواب میں پوچھنے والا بیچارا نہیں نہیں کہتا رہا تب عمرو بن مرہ نے کہا کہ "دیکھو بھائی مسلمان کا جن مسائل پر اتفاق ہے محکمات بھی ان ہی کو کہتے ہیں ان کو پکڑ لو اور اختلافی مسائل میں زیادہ غور و خوض کی ضرورت نہیں ان کی نوعیت متشابہات کی ہے" اور آخر میں وصیت کی۔

"اہل کتاب کے بعد دین مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہمارے بزرگوں نے یعنی صحابہ نے دین کو جس شکل میں پایا اور پہنچایا بس ان ہی کا طریق کار اور ان ہی کا شیوہ اختیار کر کے مطمئن ہو جانا چاہیئے۔ المقدسی نے ابن مرہ کے اس بیان کو نقل کر کے ایک قاضی صاحب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جن جن لوگوں سے میں اب تک ملا ہوں ان میں سب سے زیادہ اثر یزیدان ہی سے ہوا، ان کی مجلس میں فروعی اور فقہی اختلافات کا ذکر چھڑا تو میں نے دیکھا کہ قبلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہی فرما رہے ہیں۔

من صلی هذه القبلة فهم اخواننا المسلمون۔ اس قبلہ کیطرف رخ کر کے جو نماز پڑھتے ہیں وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں

آخر میں "المقدسی" نے اپنے ان احساسات کو درج کر کے مندرجہ ذیل فقرے پر اختلافات کی اس بحث کو ختم کر دیا ہے یعنی

هذا التعصب الذی تری انما ثوره	یہ تنگ نظریاں جنہیں تم دیکھتے ہو دراصل یہ شورش جاہلوں
الجهال والمسترقون من القصاص و	کی پھیلائی ہوئی ہے اور قصہ گو واعظوں کی یہ اختراعیوں کے
غيرهم و اما الامة فعلی ما ذکرت۔	یہ نتائج ہیں امت اسلامی کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

فقیر بھی یہی عرض کرتا چلا آرہا ہے اسی پر اپنے اس مقالہ کو ختم کرتا ہے۔ واللہ ولی الامر والتوفیق وعلی اللہ قصد السبیل ومنها جائر ولو شاء لهدکم اجمعین۔۔۔۔

تمت بالخیر

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سیرۃِ رسولِ اکرم

منتخب از تصانیف

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ

ترتیب

محترم جناب محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہم

ادارۂ اسلامیات

۱۹۰- انارکلی ○ لاہور

ادارہ اسلامیات

○ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور ——— فون: ۷۲۴۲۳۱۲، فیکس: ۷۳۲۴۷۸۹ ـ ۴۲ ـ ۹۲

○ ۱۹۰۔ انارکلی، لاہور، پاکستان ——— فون: ۷۲۲۱۹۹۱ ـ ۷۳۵۳۲۵۵

○ موہن روڈ، چوک اردو بازار، کراچی ——— فون: ۷۷۲۲۴۰۱